MOMIN: HAYAT-O-SHAIRI

By

EHSAN DANISH
and
ABDUL REHMAN ISLAHI

صوکن

بے شک عوصن موصوف ہے

کیونکہ اس کی شکل سے لگتا ہے۔

حیات و شاعری

مومن

احسان دانش

عبدالرحمٰن اصلاحی

مکتبہ قصر اردو، اردو بازار دہلی

بار اول ۔ جولائی ۱۹۵۸ء
تعداد ۔ گیارہ سو
قیمت ۔ تین روپے آٹھ آنے

ناشر • قصرِ اردو
پریس • کھنہ لیتھو پریس دہلی

- یہ کتاب

- حیات

- شاعری

"یہ کتاب"

ذوق کو زندگی میں اور غالب کو زندگی کے بعد لیکن مومن کو زندگی میں نہ زندگی کے بعد وہ دور ملا جس دور کا اس کا کلام تقاضا کرتا تھا۔ ہوا، تو بس اتنا ہی ہوا کہ چند کتابیں لکھ دی گئیں۔ اور چند جرائد کے خاص نمبر نکال دیئے گئے۔ یہ ناکافی ہی نہیں بلکہ نہایت معمولی یا نہ ہونے کے برابر حصہ ہے اس حصے کے مقابلے میں جو ذوق کو زندگی میں اور غالب کو زندگی کے بعد دربارِ عوام سے ملا، مومن کسی طرح بھی اور کہیں بھی غالب سے پیچھے نہیں رہتا جہاں مومن کا شعلہ لپک جاتا ہے وہاں کسی دوسرے اردو شاعر کا چراغ لو بھی نہیں دیتا۔

عجیب دستور ہے، دربارِ عوام کا کہ کسی کے دامن میں موتی رول دیتا ہے کسی کو اس سے بھی سوا دیتا ہے اور کسی کے حصے میں سیپ اور گھونگے بھی مشکل سے آتے ہیں۔ ایسا کہیں بھی نہیں ہوتا لیکن وہاں اس سے مفر نہیں جہاں عوام کا شعور ٹمٹما رہا ہے مگر جگمگا نہیں رہا۔ یہ المیہ ہے کہ ایشیائی ممالک جو سب سے آگے تھے اب سب سے پیچھے ہیں۔ اسے رجعتِ قہقری کہیئے یا شکستہ پائی، یا دونوں لیکن کارواں وہیں رکا ہوا ہے جہاں صدیوں پہلے پہنچا تھا اور وہاں سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔

یقیناً اس کتاب سے وہ کمی پوری نہیں ہو جائیگی جو مومن کے باب میں محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن مومن سے متعلق جہاں ضیاء احمد بدایونی کی ترتیب 'دیوانِ مومن'، نگار لکھنؤ کا مومن نمبر اور دوسری کتابیں موجود ہیں وہاں یہ بھی کچھ نہ کچھ خصوصیت لئے ہوئے

موجود رہے گی۔ اس کوشش اور کاوش کو ضرور سراہا جائے گا۔ کیونکہ یہ بڑی جانکاہی اور بڑے خلوص سے مہیا کی گئی ہے۔

احسان دانش صاحب نے اس کتاب کے لئے بہت کچھ کیا ہے لِسے نبھایا ہے اسے سنوارا ہے اسے نکھارا ہے بلکہ یہ بھی کہا جائے تو درست ہے کہ اس کے لئے اتنا کچھ فراہم کیا ہے کہ اس سے اتنی بڑی اور اتنی کافی معلومات میسر آگئی ہیں لیکن عبدالرحمٰن اصلاحی کو اُن کی محنت کی داد نہ دینا بے انصافی ہو گی اُس نے رات دِن ایک کر دیئے تو موجودہ صورت ہوئی۔

میرا ارادہ تھا کہ اس کتاب کو اس دور کی تنقید کے تقاضے پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ اور سنوار دوں اس کے لئے میں تیاری بھی کرتا رہا لیکن کئی وجوہ کے سبب بالکل ویسے ہی رہنے دیا، جیسے پہلے تھی۔ شاید یہ ہی مناسب تھا، ورنہ قالب بہت کچھ بدل جاتا اور کہیں روح بھی بدلی ہوئی دکھائی دیتی۔

خدا کا شکر گذار ہوں کہ میں آج ایک فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

ظفر ادیب

مومن سے پہلے

بے جا نہ ہوگا اگر امیر خسرو سے اُردو غزل کا آغاز قرار دے لیا جائے۔ چاہے وہ صورت کتنی ہی طرح اور تیور سے جاری رہی ہو — پھر اور کچھ ہو نہ ہو یہ تو حقیقت اور بڑی حقیقت ہے کہ غزل اُن کے یہاں پورے نک سک کے ساتھ موجود رہی ہے۔ اور ان کا مطالعہ حافظ کے مطالعے کا مزا دے جاتا ہے۔ شاید یہ کیفیت اُن سے پہلے کسی ہندوستانی فارسی شاعر کے یہاں نہیں۔ وہی پہلے ہندوستانی فارسی شاعر ہیں جو غزل کا پورا رکھ رکھاؤ لئے ہوئے ہیں اور غزل بھی انھیں اسی طور سے اپنائے ہوئے ہے جیسے ممتاز فارسی شعرار کو — یا وہ غزل کو ایسے ہی جزوِ حیات بنائے ہوئے ہیں جیسے حافظ اور صرف حافظ!

یہ سلسلہ ولی تک پہنچ کر ایک الگ صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس میں اس کا اپناپن اُبھر آتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ خالص ہندوستانی ہوتا جاتا ہے قریب قریب ہر پہلو سے — کیا موضوع میں، کیا اسلوب میں — ولی کا کلام نکھری ہوئی دکنی میں ہندوستانی فضا لئے ہوئے ہے اور اسی لئے غزل کی روایت کی بنیاد ہو سکا بلکہ اس نے اُردو شاعری کو غزل کی ایک روایت دی جو اُردو شاعری کے دو دوروں میں جاری و ساری رہتی ہوئی میر کے یہاں کچھ ایسی سنوری ہوئی صورت میں اُجاگر ہوئی کہ بالکل نئی روایت بن گئی اور دور دور اس دور تک چلی آئی۔ کچھ ادھ

نکھرتی ہوئی کچھ اور سنورتی ہوئی مگر "میریت" جیسا تھا بالکل ویسا رہا۔ نہ میر کے ہمعصر سودا اور درد کے اپنے پن نے دبا نہ انشا کی شوخی اُس پہ چھا سکی مصحفی تو پیر و کار تھے ہی جرأت نے کچھ نئی چھیڑ کی تھی ناسخ نے نسخ و تغییر سے کام لیا تھا آتش نے کچھ میر کا ساتھ دیا تھا اور کچھ درد کا ۔ شاہ نصیر ناسخیت کے اِرد گرد گھومتے رہے اور نظیر اکبر آبادی بھی اپنی سی کر گئے لیکن وہ روایت ابدی ثابت ہوتی رہی اور ابدی ہو گئی۔

ذوق۔ غالب اور مومن کا زمانہ آیا تو ذوق نے خوب خوب زور مارا۔ غالب اِدھر اُدھر پھیلے۔ آسمان سے پرے اُڑے اور زمین کی تھاہ تک پہنچے لیکن غزل میں "میریت" نہ لا سکے۔ غالب تو ذہن و قلب کی وسعت کے مطابق الگ ایک سمت میں تنہا کچھ کر گئے کہ زمانہ انھیں بھولنے کی بجائے یاد کرنے کی کوشش کئے جاتا ہے شاید "میریت" کیساتھ اُن کے اعتقاد کے علاوہ اُن کا واضح اور وسیع اپنا پن ہی تھا جس نے انھیں بہت زیادہ گہرے نقش کی مانند ثبت کر دیا اور آتے رہنے والے دوروں کے لئے مثال بنا دیا۔ یقیناً یہ اچھا ہی ہوا۔ کہ ہر آتے ہوئے دور نے انھیں مثال بنایا لیکن "میریت" کی ابدیت میں فرق نہ آیا بلکہ اس کی آب و تاب اور زیادہ پختہ ہو گئی کاش ذوق بھی کوئی سلسلہ کر لیتے "میریت" تو اُن کے ۔۔۔ اُن کے کیا کسی اور کے بھی بس کی نہ تھی اور نہ ہے ذرا زبان و بیان کے چٹخارے سے اِدھر اُدھر بھی ہوتے اور شاعری کو محض زبان و بیان کا چٹخارہ ہی قرار نہ دے لیتے مگر وہ اس کے علاوہ کچھ اور خیال میں نہ لائے شاید ماحول سے بغاوت پر ایک یا دوسری وجہ سے آمادہ نہ ہوئے ورنہ انکی قادرالکلامی سے بہت کچھ توقع تھی کیونکہ انھیں زبان و بیان پر بڑی قدرت تھی بلاشبہ جو اُن کے دوسرے ہمعصروں سے زیادہ تھی مومن کسی اعتبار سے "میریت" کو اپنائے ہوئے رہے اگرچہ انکی فطرت کی پیچیدگی ان کو بھٹکاتی رہی اور انھیں دور ہی دور ہٹاتی رہی۔ یہی بھٹکنا اور دور رہنا انھیں

اُن کا اپنا پن بنا تا ہوا محسوس ہوا، اگرچہ غزل کا اپنا پن نہیں بن رہا تھا بلکہ وہ خاص
اچھے پن کو کھو رہے تھے بالکل اسی سبب وہ جرأت ہو سکے نہ میر ہو سکے اگر مومن ہوئے بھی
تو جیسا انھیں مومن ہونا چاہیے تھا ویسے نہ ہوئے بہت سے بگڑے ہوئے اور تھوڑے
سے سنورے ہوئے۔ وہ میر کے قریب رہتے ہوئے بھی ایک اُن سے بھی زیادہ خوبصورت
اپنا پن اُبھار سکتے تھے۔ اس وقت اُن کی یہ گنجلک اور یہ پیچیدگی نہ رہتی وہ ایک اور چیز
ہی بن کر ابھرتے جو میر کی نقل بھی نہ ہوتی اور وہ بھی نہ ہوتی جو وہ اس صورت میں ہے۔
میر یعنی خالص میر ایک زندہ اور پائندہ حقیقت تھے۔ جہاں کہیں وہ
خالص میر رہتے ہیں وہاں آفاقی صداقت (Universal Truth)
بن جاتے ہیں اور جہاں کہیں وہ خالص میر نہیں رہے وہاں وہ اپنی حقیقت سے
دُور ہو گئے ہیں یعنی اپنی زندگی سے دُور ہو گئے، اپنے آپ سے دُور ہو گئے اور کچھ اور
ہی بن گئے جو وہ واقعتاً نہ تھے۔ انہوں نے ایسے مقامات پر تبیتی کا سہارا نہیں لیا بلکہ سُنی
کے بھروسے پر رہے یہی سبب ہوا کہ آنچ آنچ نہ رہی بلکہ آنچ کا بہروپ ہو گئی۔ روپ تو روپ
ہی ہوتا ہے اس سے بہروپ کا کیا مقابلہ؟ کہیں اصل اور نقل کا امتیاز چھپا رہتا ہے،
اہل نظر تو بھانپ ہی جاتے ہیں کہ بہروپ بھرا گیا ہے اور یہاں نقلیت نے اصلیت
کی جگہ لے لی ہے کیونکہ میر کی شاعری بھیانک درجہ تک صداقت ہے اسی لیے
وہ بے آب و تاب نہیں ہوئی بلکہ اور اور چمکتی چلی گئی اور اور چمکتی چلی جائے گی۔
اسی لئے کہ یہ زندہ روایت بے پیرو کار نہیں رہی۔ اگرچہ اسے زندہ و تابندہ
رہنے کے لئے پیروکار کی بھی ضرورت نہیں۔

یہ اطمینان کا مقام ہے کہ مومن نے غزل کی زندہ روایت کو مرنے نہیں دیا

اور اسے زندہ رکھنے کے لئے وہ اپنی زندگی دیتے رہے، واقعہ ہے کہ اس حد تک بھی اُردو کے کسی دوسرے شاعر نے اس زندہ روایت کا ساتھ نہیں دیا۔ غالب معتقد ہوئے لیکن وہ اُبھار لے گئے اپنے آپ کو ـــــ اور اچھا ہی اُبھار لے گئے۔ یہ اُن کا جوشِ طبع اور علوئے دل و دماغ ہی تھا، جس نے انھیں میرؔ کے برابر قد آور کر دیا۔ اگرچہ میرؔ کا زمانہ اور غالبؔ کا زمانہ بہت بہت مختلف تھا ایک دوسرے سے ـــــ پھر بھی یہ کمال تھا غالبؔ کا کہ وہ قریب قریب ایک الگ روایت کے ساتھ اُبھرے، جو ابدی بھی ہے اور جو مٹنے والی یا دبنے والی نہیں۔ یہی وجہ ہے مومنؔ کی شخصیت غالبؔ کی شخصیت سے دبی دبی رہی۔ اگر مومنؔ میں میریت پورے طور سے اُبھر آتی تو اُن کی شخصیت اس طور سے دبتی ہوئی نہ ہوتی بلکہ یقینی طور پر متوازی تو ہوتی ہی! اب بھی بہت کچھ ہوئی اور ایک حد تک قابلِ اطمینان ہوئی ـــــ ممکن ہے کہ اس سے کوئی اور اثر لے اور وہ کچھ کر جاتے جو مومنؔ نہیں کر سکے یا مومنؔ نے کرنا نہیں چاہا۔ ـــ وجہ خواہ کچھ ہی ہو ـــــ تو مومنؔ نے امیر خسرو۔ ولیؔ۔ اور میرؔ کی غزل کی بتدریج بڑھتی ہوئی روایت کو زندہ رکھا اور اس روایت کی مشعل کو اپنے بعد آنے والے دور کو حوالے کرنے کا مقدس فرض ادا کر دیا۔ یہی فی الواقعی بہت ہے۔

حیات

پیدائش اور خاندان
تعلیم و تربیت
طبابت
نجوم اور دیگر مشاغل
ذریعۂ معاش
لباس و حلیہ
اخلاق و کیرکٹر
ماحول
تحریک اصلاح جہاد
تحریک جہاد میں مومن کا حصّہ
مومن کی نظر میں سیّد احمد شہید رح کا مرتبہ
مذہبی مسلک
معاصرین
ظرافت اور بذلہ سنجی
مومن کی زندگی کا ایک رومان
وفات
تصنیفات
اولاد
تلامذہ

پیدائش اور خاندان حکیم مومن خاں ۱۲۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۰۰ء میں محلہ کوچہ چیلاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں اور دادا کا نام حکیم نامدار خاں تھا۔ حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی شاہ عالم کے عہدِ حکومت میں کشمیر سے آ کر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اور خوش قسمتی سے شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ شاہی خدمات کے صلے میں موضع بلاہہ پرگنہ نارنول میں بطور جاگیر عطا ہوا ۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا کی تو پرگنہ نارنول اس میں شامل تھا۔ نواب نے اس جاگیر کے عوض میں حکیم نامدار خاں کے ورثا کو ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ جس میں حکیم مومن خاں بھی شامل تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بھی مومن خاں کے خانداں کے چار طبیبوں کو سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی جس میں سے ایک چوتھائی ان کے والد کو ملتا تھا اور ان کے بعد کچھ دنوں تک مومن خاں کو ملتا رہا۔

حکیم مومن خاں کے والد حکیم غلام نبی خاں کو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے بہت عقیدت تھی۔ مومن خاں جب پیدا ہوئے تو حکیم غلام نبی خاں نے حضرت شاہ صاحب کو تکلیف دی اور اس قدسی صفت بزرگ نے نومولود کے کانوں میں اذان دی اور شاہ صاحب ہی نے اس مولود مسعود کا

نام "مومن خان" تجویز فرمایا۔ گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور اس کے بجائے "حبیب اللہ" نام رکھنا چاہا لیکن شاہ صاحب ہی کا نام بگین شہرت بنا۔

تعلیم و تربیت | مومن خاں کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی خدمت میں بھیجوا دیا۔ حافظہ اس بلا کا پایا تھا کہ شاہ صاحب کی زبان مبارک سے نکلا ہوا کوئی لفظ مشکل بھولتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس ذہین لڑکے نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا وعظ ایک بار سُن کر لفظ بلفظ دُہرا دیا۔ غرض درسیات کی تکمیل ایسے گھرانے میں کی جو نہ صرف ایک مدت تک دہلی میں اپنے علم و فضل کی بنا پر ممتاز رہا۔ بلکہ آج بھی اس کے فیوض و برکات کی یادگاریں پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں مومن نے اس گھرانے کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ العزیز کے وصال پر وہ بے بدل تاریخ لکھی ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حقِ شاگردی ادا کر دیا۔ شعر یہ ہے۔

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے ۔۔۔ فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

طبابت | مومن نے درسیات ختم کرنے کے بعد اپنے والد حکیم غلام نبی خاں اور اپنے چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ اور اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" حکیم مومن خاں کی شخصیت بھی "مومن شاعر" کی شخصیت میں جذب ہو کر رہ گئی ہا مومن نے طب پڑھی۔ طبابت کی

مگر وہیں تک جہاں تک ان کے عاشقانہ انداز طبیعت کا تقاضا تھا اکثر
غزلوں کے اشعار میں اس کے مسائل اس طرح بیان کئے ہیں کہ شعر میں
لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اور جذبات شاعری کے ساتھ علم الابدان اور تشریحِ
اعضا و مزاج انسانی کا ایسا پیوند لگایا ہے کہ ان کی شاعری کیلئے ایک میدان
نکل آیا۔ اور اس طرح مومن کے یہاں طب نے شاعری کا جامہ پہن لیا ہے۔
"مثنوی قولِ عین" میں حکیم مومن شاعر کے لباس میں یوں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

میں نے اُس نبض پر جو ہاتھ دھرا ہاتھ سے میرے میرا دل ہی چلا

اس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے دل سے بس ہاتھ اٹھایا میں نے

آفت تازہ جو جاں پر آئی یہ غزل اپنی زباں پر آئی

کیا لگا دستِ دل آرام سے ہاتھ دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
کس کے ہاتھوں سے لگا تھا کہ جدا نہیں ہوتا دلِ ناکام سے ہاتھ
ہاتھ دیتے تو ہو اب ہاتھ بیں پہ کان پر رکھئے گا پھر نام سے ہاتھ
کیا کہوں آہ بقولِ مومن دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

ادبِ اردو اس غزل کیلئے مومن کی طبابت کی زیر بار احسان ہے
خاں موصوف کو شاعری سے خاص مناسبت تھی، ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم

کو اپنا کلام دکھایا۔ مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینا چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا۔ لیکن پھر بھی مومن کا کلام شاہ نصیر کے رنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لکھنؤ اور دہلی کے کسی شاعر کا رنگ اگر کچھ مل سکتا ہے۔ تو وہ شیخ ناسخ اور شاہ نصیر ہیں۔ مومن ذوق، غالب تینوں نے مل کر ناسخ کا تتبع کرنا چاہا۔ اور آخر میں ہر ایک نے اپنی شاعری کا رنگ بدل کر اعتراف عجز کیا۔ ناسخ کا تتبع اور شاہ نصیر کی شاگردی بیکار نہیں گئی اور بعض غزلوں کو بے تاثیر اور بے مزہ کر کے رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب اور مومن کی بعض غزلوں کی بے تاثیری اور پھیکا پن اسی تتبع ناسخ کا نتیجہ ہے۔

نجوم اور دیگر مشاغل

مومن کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ اس فن میں ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن سنکر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر اس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے اور نہ تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو جو میں کہتا جاؤں اسکا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے۔ اور سوال کرنے والا اکثر تسلیم کرتا جاتا تھا۔ ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا۔ انکے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبد الکریم اس وقت موجود تھے۔ خانصاحب نے اسے دیکھ کر کہا کہ تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے؟ اس نے کہا کہ صاحب میں لٹ گیا۔ کہا خاموش رہو جو میں کہوں اسے سنتے جاؤ۔ جو بات غلط ہو اس کا انکار کر دیتا۔ پھر پوچھا کیا زیور کی قسم سے تھا؟ اس نے کہا صاحب! ہاں وہی عمر بھر کی کمائی تھی۔ کہا تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے کوئی غیر چرا نے نہیں آیا ہے کہ میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا۔ ہم کیوں چرانے ہنس کر فرمایا کہ کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال کہیں باہر

نہیں گیا ہے۔ اُس نے کہا صاحب سارا گھر ڈھونڈ مارا۔ کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ فرمایا پھر دیکھو۔ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا۔ صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے ایک ایک کونہ دیکھ لیا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ خانصاحب نے کہا کہ اسی گھر میں ہے۔ تم غلط کہتے ہو۔ کہا آپ چل کر تلاش لے لیجیے۔ میں تو ڈھونڈھ چکا۔ فرمایا میں یہیں سے بتاتا ہوں۔ یہ کہکر اس کے گھر کا سارا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔ وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ پھر کہا اس گھر میں جنوب کے رُخ ایک کوٹھڑی ہے۔ اور اُس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے۔ اسکے اوپر مال موجود ہے جاکر لے لو۔ اُس نے کہا مچان کو تین دفعہ چھان مارا۔ وہاں نہیں ملا۔ فرمایا اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ بغرض وہ گیا اور حسب روشنی کرکے دیکھا تو ڈبہ اور اس میں سارا زیور جوں کا توں سارا وہیں سے مل گیا۔

طبابت کی طرح مومن کی اختر شناسی بھی اِن کی عاشقانہ طبیعت کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوئی چنانچہ نجوم سے مومن وہی کام لیتے ہیں جو ایک عاشق کو لینا چاہیئے۔ ایک بار یہ اختر شناس آتشِ فراق سے جل رہا تھا۔ کچھ دل میں آیا زائچہ اٹھایا دیکھا تو ستارے مہربان تھے۔ اُمید وصل سے دل کو تسکین دی اور جوش میں اپنے مطلوب کو جاکر یوں مطلع کیا۔

کہاں ہے بدرِ سیما وہ ترحم | کہ ہوں میں رازدانِ سیرِ انجم
نہیں کیا تم نے احکام آزمائے | انہیں باتوں نے تو یہ دن دکھائے

یہ سب کچھ سچ ہوا تھا بھی کہیں گے | کہ جینے میں تو اگلے دن مل رہینگے

سلیماں ہمدمِ بلقیس ہوگا قرانِ زہرہ برجیس ہوگا

ابھی ہے گر حجاب کم ہو تو اچھا زیادہ ربطِ باہم ہو تو اچھا
نہیں تو ہوگی اسکی شرم ساری کسے منظور ہے خجلت تمہاری

لیکن یہ آسمان ہمیشہ مہربان نہیں رہتا۔ چنانچہ مومن بھی رازدانِ انجم ہونے کی حیثیت سے خود اپنی روشنی طبع کا رونا روتا ہے۔ وہی اختر شناسی جو قرانی میں وصلِ یار کا مژدہ سنا سکتی ہے کبھی بد نصیب منجم عاشق کو اسکی سوختہ اختری کی تلخ حقیقت سے مطلع کر کے ہمیشہ کے لئے قبل از وقت برباد کر سکتی ہے۔ اور ایسی صورت میں بھی آرزو کی جاتی ہے کہ اگر ازل سے سوختہ اختری ہی ہماری قسمت میں تھی۔ تو کاش ہمیں اختر شناس نہ بنایا ہوتا۔ مومن اپنی اس تیرہ اختری کو ظاہر کرنے کے لیئے کتنا لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان اختیار کرتا ہے۔

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

اختر شناس عالم کے تغیرات کو ستاروں سے منسوب کرتا ہے مگر ایک شاعر جو منجم بھی ہو ان تاروں کے دام میں عرصے تک گرفتار نہیں رہ سکتا۔ مومن پہ ایک دور وہ بھی گذرا جب نجوم غالب تھا جب وہ حوادثِ عالم کو سیرِ انجم کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ مگر چونکہ فطرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لئے بہت جلد ان پر منکشف ہو گیا۔ کہ پسِ پردہ کوئی اور قوت ہے جو ستاروں پہ حکمرانی کرتی ہے۔ کوئی پردہ نشین اور ہے جو کواکب کے اثرات کو بدل سکتا ہے۔

مومن خاں جب تک نجوم کے زیرِ اثر رہے تو اپنی طبیعت کے زور سے

زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے کہ

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

شعر میں علاوہ تخئیل اور تاثیر کی کمی نہیں لیکن اس دور کا شعر بھی دیکھئے جب منجم شاعر کی شاعرانہ فطرت نجومی طاقتوں پہ غالب آجاتی ہیں اس وقت بھی شاعر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پکار اُٹھتا ہے کہ

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراق یار میں

کاہے سے فرق آگیا گردش روزگار میں

اب دونوں شعروں کا موازنہ کیجیے اور دیکھئے کہ ایک بلند خیال ناظم "منجم" اور ایک شاعر "منجم" کا زاویہ نگاہ کہاں جا کر بدلتا ہے۔

نجوم اور رمل حکیم مومن کی بےقرار طبیعت کو زیادہ دنوں تک سکون نہ دے سکے۔ مومن نے شطرنج سے دل بہلانا چاہا۔ اور اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ دلی جیسے شہر میں ان کا شمار مشہور شاطروں میں ہونے لگا۔ کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ تھی۔ جو وہاں کے مشہور ترین شاطر تھے۔ مومن کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف بھی توجہ کی تو اس فن میں وہ نام پیدا کیا۔ کہ بڑے بڑے اہل کمال اُنکے معترف ہو گئے۔ [illegible] میں باز جو اس زمانہ میں اپنے فن کا استاد تھا۔ ان کے انتقال پر بین اٹھا کر رکھ دی کہ اب دلی میں کوئی اس کا قدرداں نہیں رہا۔ ریاضی میں بھی اُن کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ اور خواجہ محمد نصیر کے سوا اس میں اُن کا کوئی ہم پایہ نہ تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فن عملیات میں بھی دخل تھا۔ چنانچہ بعض جگہ ان کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ علمی دنیا میں ان کی تیزی ذہن اور ذکاوت طبع

کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ سوائے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے جو ان کے ہم سبق تھے کوئی بھی علوم و فنون میں ان سے گوئے سبقت نہ لے گیا۔ ایک مولانا شہید اُن کے ہم پلّہ کہے جا سکتے تھے۔ دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب جو ان کے پیر اور خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔

ذریعہ معاش:۔

مومن کا ذریعۂ معاش طبابت تھا۔ وہ اپنے آبائی مطب میں بیٹھ کر نسخہ نویسی کرتے اور بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ زمانہ قدیم سے یہ پیشہ دہلی میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے مومن نے دوسرے پیشوں پر اس معزز پیشہ کو ترجیح دی اور اس کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی اس پر گذر اوقات کرتے۔ انھوں نے عام شاعروں بالخصوص اپنے معاصرین کی طرح جا و بیجا مدح کر کے شہنشاہ ظفر کے دربار سے تنخواہ لینے کی ہوس نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو اُن کا بھی دربار شاہی سے ضرور وظیفہ مقرر ہو جاتا مگر اُن کی غیرت مند طبیعت نے اُسے گوارا نہ کیا۔ حتیٰ کہ رمل، نجوم، عملیات اور دیگر علوم و فنون کو بھی کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا جس سے اُن کی اولوالعزمی اور شانِ استغنا کا اظہار ہوتا ہے۔

لباس و حلیہ:۔

مومن کی وضع و صورت کا نقشہ عام طور سے تذکرہ نویسوں نے اس طرح لکھا ہے "رنگین طبع، رنگین مزاج۔ خوش وضع، خوش لباس، کشیدہ قامت، سبزہ رنگ سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال جن میں ہر وقت انگلیوں سے کنگھی کیا کرتے تھے۔ ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھالے پائنچے اس میں لال نیفہ ہوتا ہے"

مولانا محمد حسین آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں کہ "میں نے انہیں نواب علی خاں

اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سُنا تھا۔ ایسی دردناک آواز اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم نگاہوں کے سامنے ہے۔ باتیں کہانیاں ہو گئیں؟

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی اپنے مشہور مقالہ "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" میں لکھتے ہیں۔

"حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی کشیدہ قامت، سُرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخشی داڑھی۔ بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ۔ لمبی انگلیاں، گھونگریالے بال لمبے لمبے کاکلوں کی شکل میں، کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے، بدن پر شبنم کا انچی چولی کا انگرکھا لیکن اس کے نیچے کرتہ ندارد جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کے کمر میں لپیٹ لیا تھا۔ اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت سُرخ گلبدن کا پاجامہ مہریوں سے تنگ، اوپر ڈھیلا۔ پاجامہ کا کپڑا ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سُرخ نیفہ، انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی کبھی لٹکتی رہتی تھیں کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دوپلڑی ٹوپی اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی کہ سر منڈھ گئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے مومن کا حلیہ اور لباس وجاہت وخوش پوشاکی کا جس طرح نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے وہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں نہیں مل سکتا۔ جس زمانے کی وضع تھی اس میں تکلف اور شوقینی کی انتہا ہو گئی تھی۔ لیکن مومن کی متانت اور سنجیدگی اسکے گواہ ہیں کہ اس زمانہ میں یہ شرفاء کا خاص لباس تھا اور رؤساء واہل ثروت عام طور سے اسی وضع کو پسند کرتے تھے۔

اخلاق اور کریکٹر

مومن نہ صرف حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے شاگرد اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مجالس وعظ کے حاشیہ نشین تھے۔ بلکہ وہ ہندوستان کے جلیل القدر مجاہد مولینا احمد شہیدؒ کے مرید اور حضرت مولینا اسمعیل شہیدؒ کے ہم سبق بھی تھے۔ اُن کی شادی دہلی کے نامور خاندان رشد وہدایت یعنی خواجہ میر دردؒ کے گھرانے میں ہوئی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کے نفوس واذہان کی تربیت بہت بلند پیمانہ پر ہوئی۔ ان کے اندر اخلاق وشرافت وعلوئے نفس بدرجہ اتم موجود تھا طبیعت میں استغنا وخود داری کی شان نمایاں تھی۔ چنانچہ انہوں نے کبھی کسی امیر یا رئیس کی تعریف نہیں کی بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھا ہے۔ کہ امراء ورؤسا تو درکنار اساتذہ سلف کی تعریف کرنا اور سننا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ قصیدہ خوانی کو انہوں نے ہمیشہ "کار ہوس پیشگاں" سمجھا۔ فارسی دیوان میں لکھتے ہیں ؎

بادشاہا بایں متاع قلیل	مدح چوں از منے چرا خواہی
دیگراں دیگر و زمن دیگر	ہرچہ از بوم از ہما خواہی

طبیعت اس قدر خود دار وغیور واقع ہوئی تھی کہ کسی دوست کا احسان بھی گوارا

نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ راجہ کپور تھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو مشاہرہ مقرر کرکے
اور ایک ہزار روپیہ سفر خرچ بھیجا۔ تو انہوں نے محض اس وجہ سے انکار کر دیا۔ کہ وہاں
ایک گویئے کی بھی یہی تنخواہ ہے۔ اسی طرح ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کی پروفیسری کے
لئے مسٹر ٹامسن نے انہیں دعوت نامہ بھیجا تو اس سے بھی صاف انکار کر دیا۔

نواب وزیر الدولہ بہادر فرمانروائے ٹونک نے جو مومن کے پیر بھائی بھی تھے۔ انہیں
بلانا چاہا لیکن مومن نے نہ آنے کی معذرت میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیج دیا جس کا مطلع
ہے ؎

یاد ایام عشرت فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
پیر گردوں کیا کہ بن نہیں آتی — ورنہ میں اور تیری مہمانی

ہے ابھی آرزوئے وصل صنم — ہے ابھی حسرت ہوس رانی

چار، پانچ بار دلی چھوڑ کر سہارنپور۔ بدایوں، سہسوان۔ رام پور۔ جہانگیر آباد
گئے لیکن شاہجہان آباد کی کشش ہمیشہ وہیں کھینچ لائی۔ رام پور میں رہتے تھے۔ مگر
دلی کی یاد دل سے نہیں جاتی تھی۔

دلی سے رام پور میں لایا جنون شوق — ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

دوسری بار سہسوان گئے وہاں فرماتے ہیں۔

چھوڑ دلی کو سہسوان آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

اسی طرح بدایوں میں بھی دلی کا خیال نہیں جاتا۔

بدایوں میں مجھے جوش جنوں لایا ہے دلی سے — یہ کیونکر چارۂ پند خردمندان وحشی ہوا،

خود داری و غیرت کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی صلے کی امید میں کسی رئیس کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا۔ اُن کے صرف دو قصیدوں میں دو مدحیہ قصیدے ہیں ایک تو اعتذار میں لکھا گیا۔ اور دوسرے کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دن راجہ اجیت سنگھ برادر کرم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے۔ اور انکی فیاضیاں پورے شہر میں ضرب المثل تھیں۔ وہ ایک دن اپنے مصاحبین کے ساتھ سامنے اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ مومن خاں کا ادھر سے گذر ہوا۔ لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں راجہ صاحب نے آدمی بھیجکر بلوایا اور انہیں نہایت عزت و تعظیم کے ساتھ بٹھایا۔ نجوم اور شعر و سخن کے متعلق کچھ باتیں کیں اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ۔ ہتھنی حاضر ہوئی اور وہ مومن کو عنایت ہوئی جس کے شکریہ میں مومن نے وہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری

کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

صاحبِ آبحیات کا خیال ہے کہ سوا اس قصیدہ کے اور کوئی مدح کبھی دنیا دار کی صلہ کی توقع پر نہیں لکھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قصیدہ در اصل اعترافِ احسان اور شکریہ میں لکھا گیا۔ نہ کہ کسی انعام اور صلے کی موقع پر جناب رام بابو سکسینہ مصنفہ تاریخ ادب اردو" کا خیال صحیح ہے کہ "راجہ کا ہاتھی پیش کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ راجہ صاحب مومن کی خدمت میں ہاتھی پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مومن نے نہ تو تمام عمر کسی دنیا دار کی مدح کی اور کبھی کی ہجو میں اپنی زبان آلودہ کی چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

ہجو گوئی نہیں ہمارا کام ایسی باتوں سے خامشی بہتر

اس میں شک نہیں کہ مومن اپنے معاصرین بہت کم کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کو خود ستائی کی بھی عادت نہیں تھی۔ جو عموماً شعراء کا عام شعار رہا ہے چنانچہ انہیں خود اپنی تعریف کرتے ہوئے روحانی تکلیف ہوتی ہے

لاف زنی پس سخن زمانہ کیا کروں ۔ اس غم تازہ سے نہیں مجھ کو امید جاں بری

ہاں مومن خوددار ضرور تھے لیکن مغرور و متکبر نہ تھے۔ وہ کسی کی مدح باذم کو اپنی طبیعت کے خلاف کبھی گوارا نہ کرتے تھے لیکن اظہارِ حقیقت میں اُن کو کبھی عار بھی نہ تھا بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ کسی کے کمال کا اعتراف نہ کرتے تھے یہ مومن پر سراسر بہتان ہے۔ حقیقت میں انہوں نے مومن کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ اس قسم کی باتیں نہ کرتے۔

ماحول :-

مومن کا ماحول کئی لحاظ سے بہت اہم ہے اس وقت سلطنت دہلی کی آخری شمع جھلملا رہی تھی اور انگریزی تسلط کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دہلی تک پہنچ گئی تھیں۔ اور انگریزوں نے ضعیف العمر شاہ عالم کو جو مرہٹوں کے زیر اثر تھا اپنے قبضے میں کر لیا تھا سرجی ارجن گانو کے صلحنامے کی رو سے سندھیا نے دوآب کا علاقہ مع آگرہ اور دہلی کے انگریزوں کے سپرد کر دیا وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے ایک زمانہ میں شان عجم اور شوکت روم حقیر معلوم ہوتی تھی نیست و نابود ہو گیا۔ اور مغلوں کی حکومت سمٹ کر قلعے کی چہار دیواری تک محصور رہ گئی۔

شاہ عالم کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر ثانی مسند حکومت پر متمکن ہوا ۱۸۳۷ء میں

اس کے مرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر جو دودمان تیموریہ کا آخری چشم و چراغ تھا تخت نشین ہوا۔ اسکی حکومت کی بساط ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں درہم برہم ہو گئی۔ اس وقت تاحدِ نظر برطانوی پرچم لہراتا نظر آتا تھا۔ سیاسی۔ اخلاقی۔ اور روحانی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ قوائے عمل شل ہو چکے تھے۔ اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا۔ دستبردِ زمانہ سے اگر کوئی چیز رہ گئی تھی۔ تو صرف اوہام و خرافات کا تار و پود لوگ مذہب کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے لیکن حقیقت میں اس کی اصلی روح ان کے اندر سے بالکل ختم ہو چکی تھی۔ امراء "مے در امش و رنگ" میں مست و خراب تھے عوام وحشیانہ پستی اور گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ تعلیم مردہ ہو چکی تھی۔ چند درسگاہیں جو اس ہولناک زوال میں باقی تھیں۔ وہ بے توجہی و بے مائگی کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں۔ امراء و رؤساء آزاد و بے عنان تھے۔ اس نظام مراتب کے نیچے جمہور دبے جا رہے تھے۔ دیہاتی اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود تھے۔ تجارت اور زراعت دونوں سدرمق کے لئے کی جاتی تھیں۔ اسلام کی پاکباز توحید پر سفیہانہ توہم پرستی اور پراسرار تصوّف کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ عوام تعویذ اور گنڈوں پر پورا اعتقاد رکھتے تھے۔ فقیر اور درویش ہر طرف اپنا اثر جمائے ہوئے تھے۔ لوگ بزرگوں کی زیارتوں کے لئے جاتے تھے۔ اور اُن کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے۔ کہ اسکی۔ طاعات بلا واسطۂ وسیلہ ہو ہی نہیں سکتی۔ احکامات قرآنی کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اور اکثر ان کے خلاف بھی قدم اُٹھایا جاتا تھا۔ شراب اور افیون کا استعمال عام

عام تھا۔ زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمالِ قبیحہ کھلم کھلا کیے جاتے تھے! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی روحِ اصلی ختم ہو گئی ہے اور صرف بے معنی، رسوم اور مبتذل توہمات باقی ہیں۔

ڈاکٹر ہرکلیبٹ نے "اسلام ان انڈیا" ۱۸۲۷ء میں ان رسموں اور تہواروں کا حال تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جو پیر بندہ نواز، گیسو دراز، شاہ مدار اور پیر دستگیر کے سلسلے میں منعقد ہوتے تھے۔ وہ ایک مقام پر لکھتا ہے۔

"مسلمانوں میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کے ملنے سے بہت سی ایسی رسمیں پیدا ہو گئیں جو اسلام کی روح کے سراسر منافی ہیں سحر اور جادو سے متعلق بہت سی باتیں جو ان کی معاشرت کا جزو بن گئیں ہیں اسی قبیل کی ہیں مسلمان جاٹ اور راجپوتوں میں شادی۔ ولادت۔ وفات کی اکثر رسمیں ہندوانہ ہیں وہ بعض اوقات وراثت میں ہندوؤں کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ اور مصیبت میں مقامی ہندو دیوتاؤں سے مدد مانگتے ہیں۔ شمالی و مغربی صوبے اور بلوچستان میں بھی جہاں ہندی اثرات بہت کم ہیں مظاہر پرستی نظر آتی ہے۔ پیر و مرشد کو اختیاراتِ کلی حاصل ہیں وہ مصیبت کو دور کر سکتا ہے۔ بیمار کو اچھا کر سکتا ہے اولاد بہم پہنچا سکتا ہے اور مُردے کی عاقبت سنوار سکتا ہے"

مذہبی و اخلاقی حالت کا اس سے زیادہ دردناک منظر "سیرت احمد شہیدؒ" کے مصنف نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۲ تا ۳۰۔ یہاں صرف مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"سنت و شریعت بے معنی الفاظ تھے اور بہت سے حلال و حرام شعائر اللہ

رہے تھے۔ قرآن وحدیث کے بہت سے احکام منسوخ ہو گئے تھے۔ مثلاً بیوہ کا نکاح اور تقسیم میراث شرفائے اسلام کی نئی شریعت میں مستحب فرضی سے حرام و متروک تھے۔ قرآن ایک چیستاں تھا جس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ نہ اس میں غور کرنے کی ضرورت تھی اور نہ اُس پر عمل کرنے کا سوال مسلمانوں جیسی، فاتح اور زندہ قوموں کے خصائص رخصت ہو رہے تھے۔ اس درخت کو گھن لگ گیا تھا۔ امراء مند سطین سے غرباء تک عیاشی عام تھی اور ہر ایک نشے میں سرشار تھا۔"

"پنجاب میں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ نازک تھی سکھ انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ اذان بند کر دی گئی تھی۔ اور بہت سی مسجدیں ویران پڑی تھیں۔ بادشاہی مسجد فوجی گودام میں تبدیل ہو گئی تھی۔ موتی مسجد کا نام موتی مندر رکھ دیا گیا تھا۔ سنہری مسجد پر بھی سکھوں کا قبضہ تھا۔ اس کا تمام فرش گوبر سے لیپا ہوا تھا۔ امرتسر میں ایک مسجد بھی مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔ اور کوئی شخص آزادی کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔"

تحریکِ اصلاح و جہاد:۔

ٹھیک اسی زمانہ میں مولٰینا سید احمد شہید بریلویؒ نے اپنی مذہبی اور اصلاحی تحریک شروع کی۔ انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے تعلیم پائی تھی۔ اور اکثر مسلمان ان کے مرید و معتقد تھے۔ انہوں نے بلادِ اسلامی میں اپنے خیالات کی اشاعت کی اور ہندوستان میں بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی تحریک کو پھیلایا۔ ۱۸۲۸ء میں انہوں نے مولٰینا اسمٰعیل شہید کے ہمراہ سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور ۱۸۳۱ء میں دونوں جنگ کرتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر

شہید ہوئے۔

سید احمد شہید کی تحریک جس کو رسٹنجے لوتھر کی تحریک کے مشابہ قرار دیا ہے رفتہ رفتہ انگریزوں کے لئے بھی خطرے کا باعث بن گئی تھی۔ ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے "ہندوستانی مسلمان" میں اس کی وضاحت تفصیل کے ساتھ کی ہے اور لکھا ہے کہ وہابی مبلغین اس آبادی کو جو آئندہ ماضی میں اپنے مسلسل غلامی کو نہیں دیکھ سکتی برابر حکومت کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔

تحریک جہاد

مومن خاں سید احمد شہید کی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ اور وہ اس تحریک کی علمبرداری میں ہمیشہ کوشاں رہا کرتے تھے۔ ہندوستان رفتہ رفتہ انگریزوں کے قبضے میں جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مومن کا احساس خود دار دل دکھتا تھا۔ دلی میں کوئی الساتھا جس سے وہ اپنا دردِ دل کہتے۔ سارا غبار شعر کہہ کر نکالتے تحریک جہاد کی وجہ ان کی زبان سے سن لیجئے۔

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا

تر سا صنم کو دیکھ کر نصرانیوں میں ہم

ایک موقع پر کہتے ہیں۔

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے

جلد مومن لے پہنچ اس "مہدی دوراں" تلک

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ستارہ سحری کی طرح جھلملا رہا تھا اور شعرائے عصر اسی کو غنیمت سمجھ کر حریصانہ انداز کے ساتھ اس سے مستفید ہو رہے تھے

سلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے تھے۔ ذوق کو ظفر کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ اور وہ بالکل خلاف ضمیر "ظفر شہنشاہ عالم" دعا میاں کو یہ کہکہ اس مفلس و بے دست و پا بادشاہ کو لوٹنا چاہتا تھا۔ غالب بھی یہی حسرت اپنے ساتھ لے گئے کہ وہ کبھی نہ ذوق کی جگہ ہوئے۔ لیکن مومن سمجھتا تھا کہ ایسے وقت میں بادشاہ کی مدح کرنا حقیقتاً زخم پر نمک چھڑکنا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں نہ ذوق کی سی لابہ گری ہے اور نہ غالب کا سا "ناخدا باشد بہادر شاہ باد" والا انداز بیان، اور نہ دیگر حکام کی ثناگستری و منقبت اس کے برخلاف وہ مثنوی جہادیہ میں لکھتے ہیں۔

جو داخل سپاہ خدا میں ہوا		فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیب حبیبِ خداوند ہے		خداوند اسی سے رضامند ہوا

امام زمانہ کی یاری کرو		خدا کے لئے جاں نثاری کرو

آخر میں دعا کرتے ہیں۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب		یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار		پر تیرے کرم کا ہوں امیدوار

تو اپنی عنایت سے توفیق دے		عروج شہید اور صدیق دے

اسی مضمون کو ایک جگہ رباعی میں یوں بیان کرتے ہیں۔

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں		ہے عزم جہاد چل دیجئے دہاں

انصاف کہ دخل اسے رکھتے ہو عزیز		وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

وہ غیر ملکی حکومت کے اقتدار سے سخت نالاں تھے۔ اور ہمیشہ اس سے نفرت و بیزاری کا اعلان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں فرماتے ہیں۔

ابنِ علیسویاں برلب رساندند | جانِ من و جانِ آفرینش
تا چند بہ خوابِ ناز باشی | فارغ ز فغانِ آفرینش
مومن شدہ ہم زبانِ عرفی | از بہرِ امانِ آفرینش
برخیز کہ شورِ کفر برخاست | اے فتنہ نشانِ آفرینش

ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے اندر ایک قومی و انقلابی شاعر ہونے کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

مومن کی نظر میں سیّد احمد شہیدؒ کا مرتبہ:-

مومن کو ہندوستان کے اس جلیل القدر مجاہد اور انقلابی لیڈر کے کارناموں اور بلند مرتبت شخصیت سے بیحد عقیدت پیدا ہو گئی تھی وہ بار بار اپنے اشعار میں اس کے عظیم الشان مقاصد کا اظہار نہایت دلبرانہ اور والہانہ انداز میں کہتے ہیں اور اس ذات کی بزرگی و عظمت کے سامنے برابر اپنی ارادت و عقیدت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں

گلاب نابِ سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ | کہ فکرِ راحت لبِ بطِ قسیم کوثر ہے،
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمدؒ | کہ محض مقتدیٔ سنتِ پیمبر ہے۔
وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جسکا سال خروج | امام برحق مہدی النشاں علی فر ہے۔
(سنہ ۱۲۴۲ھ)

ایک مثنوی میں اپنی دلی ارادت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا | کہ جو پیرِ دِ اس کا ہے سو پیشوا

وہ نورِ مجسم وہ ظلِ الٰہ — کہ سائے سے جس کے خجل مہر و ماہ
نہ ہے سید احمد قبولِ خدا — سرِ امتحان رسولِ خدا

بلکہ وہ انہیں "مہدیٔ دوراں" سمجھتے تھے۔

شوقِ بزمِ احمد و شوقِ شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہنچ اس "مہدیٔ دوراں" تلک

مذہبی مسلک:۔

مومن اپنے عقائد میں خواہ مذہبی ہوں یا سیاسی نہایت شدید واقع ہوئے تھے اُن کی شاعری بھی اسی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ تقلید و بدعت سے سخت نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں

یہ کچھ رہ سنت نہ طریقِ توحید — بچہ کیا ہے نہ در سب کی یکساں توحید
ہم سمجھے ہیں معنیٔ حقیقی یعنی — محبوب دلِ حقیقت ہیں بہ محلِ تقلید

ایک اور جگہ اپنے مذہبی خیالات بڑے جوش سے بیان کرتے ہیں

اربابِ حدیث کا میں قرباں ہوں — تقلید کے منکروں کا صدقے ہوں
مقبولِ روایت ائمہ نہ قیاس — یعنی کہ فقط مطیعِ پیمبر ہوں

قصائد اور مثنویوں میں اثنا عشریوں پہ حملے ہیں۔ غزل اور رباعیاں حنفیوں کے لئے وقف ہیں ایک قصیدہ کے تشبیب کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ بد شعار طرح دار دلربا جس سے — امیدِ وصل نہ تاب کے آرزو مشکل
وہ شوخ بے سبب آزار لے گنہ خونریز — کہ جرم قاتلِ عشاق کا نہ ہو حتیٰ قتل
وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصلِ دین کہے — دمِ شکایتِ عاشق نہ ہو جفا سے خجل

وہ رہیں کہ خدا ایک ہے بدا ثابت	نہیں ہے غیر زلیس اعتقاد کے قابل
وہ کج ادا صنم خود پسند کافر کیش	کہ جس کے زعم میں باطل حق اور حق باطل
وہ فتنہ گر بت حق ناشناس ناانصاف	جو فرض عین گنے کین وادر عناد دل

پھر ایک جگہ کہتے ہیں

نرالا سب سے اس کا کیش و آئین	رقیب اہل بیت و دشمن دیں
عقیدہ خونریز کا سمہ اجرا ہے	فضائے خانۂ دشتِ کربلا ہے
گلے پر شہیدوں کے لگے خاک	جو مرے کا اس مذہب میں ناپاک
نہ ڈھونڈے قتل عاشق میں سبب کچھ	برائے مصلحت جائز ہے سب کچھ

ان کی غزلوں میں بھی یہ صلابت دین اور پختہ مذہبیت بدرجہ اتم موجود ہے

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں ،	مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

اسی طرح سے بعض لوگوں پر خالص مذہبی نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔

یہ چند منافق سراپا بدعت	ہے کفر و ضلال و فسق جنگی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی امام حق کو	گویا کہ جہاد ہے خلافِ سنت

معاصرین

مومن کے معاصرین کے نام تذکرہ نویسوں نے حسبِ ذیل گنائے ہیں:-

غالب، ذوق، آزردہ - شیفتہ، علوی - صہبائی - عیش - عارف - درخشاں -

علائی۔ سالک۔ بیتاب۔ حضور۔ برق۔ میر صاحب۔ شور۔ آزاد۔ تائب۔ تسکین۔ تشنہ۔ حزیں۔ شہرت۔ عزیز۔ رقم۔ تعشق۔ تابش۔ تمکین۔ عاشق۔ اوج۔ نازنین۔ تصویر۔ فلق۔ کامل۔ تجلی۔ جوش۔ یکتا۔ تنویر۔ جعفری۔ بسمل۔ بیدل۔ شوق۔ تسلی۔ نالاں، ماہر۔ مجنوں۔ اشکی۔ حشمت۔ ایجاد۔ رسا۔ رفعت۔ قناعت۔ حیا۔ ظہیر۔ صابر۔ داغ۔ احسان۔

یہ وہ معاصرین ہیں جو مومن کے ساتھ ایک مشاعرے میں شریک ہوتے تھے، جن کا ذکر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مقالہ میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

غالب فرماتے ہیں۔

شہرا خوش نفسانند سخنور کہ بود | باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن نیر صہبائی و علوی و انگاہ | حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

مومن، نیر، صہبائی۔ علوی، حسرتی، شیفتہ، اشرف اور آزردہ اس زمانہ کے سب سے بڑے اہل کمال ہیں اور انہیں کی آتش بیانیاں گرمیٔ محفل کا باعث تھیں۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن کی ذات " باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں سے عبارت تھی۔ جن ارباب کمال کے نام اس شعر میں آتے ہیں ان میں مومن کو غالب سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ مولانا حالی "یادگار غالب" میں فرماتے ہیں " اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا کہ کاش مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔ اس شعر کو غالب نے اپنے متعدد خطوں میں بھی نقل کیا ہے" مومن کی وفات پر غالب کو جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ اس شعر سے ہو گا۔

کافر باشم اگر برگ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم تا عمر

ظرافت و بذلہ سنجی:-

مومن کی طبیعت میں مزاح و تفنن بھی بے حد تھا اور وہ اکثر بذلہ سنجی و ظرافت کا بھی اظہار کرتے ان کے کسی شاگرد نے غزل میں یہ شعر لکھا۔

ہجر میں گیسو تکرے پھیروں ہر سُو نہ گھبرایا ہوُا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوُا

تو مومن نے شعر کے پہلے مصرعے کو یوں بدل دیا۔ ع

اس طرف کو دیکھنا بھی ہے تو شرمایا ہوُا۔

اہلِ مذاق جانتے ہیں کہ ذرا سی تبدیلی سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔
ایک اور شخص نے الٰہی بخش کا سجع لکھا تھا۔ ع

مُہ گنہ گار کہ الٰہی بخش

مومن نے یوں کر دیا۔ ع

میں گنہگار ہوں الٰہی بخش

اسی طرح ایک شخص زین خاں نامی حج کو گیا۔ راستہ ہی سے واپس چلا آیا۔
تو مومن نے انکی ناکام مراجعت کی جو تاریخ کہی وہ حسبِ ذیل ہے۔

"چوں بیاید ہنوز خر باشد"

اسی طرح حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب جو دہلی کے ایک باکمال بزرگ تھے۔
جب ہجرت کی تو مومن نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہا۔

گفتیم حبیب عصر اسحٰق بہ حکم شہنشہ دو عالم

نگذاشتہ وارِ حرب امسال جا کردہ بہ مکۂ معظم

وحیدِ عصر اسحٰق کے اعداد مکۂ معظم کے اعداد کے ساتھ ملاؤ اور وارِ حرب کے اعداد اس میں سے نکال دو تو ۱۲۶۰ھ تاریخ ہجرت نکلتی ہے۔

ایک شخص قلعہ دہلی سے نکالا گیا تھا۔ آپ نے حسبِ ذیل تاریخ کہی

ز باغِ خلد بیروں شیطان بے حیا شد

باغِ خلد کے اعداد میں سے شیطان بے حیا کے عدد نکال دو تو ۱۲۳۶ھ رہتے ہیں۔

غرضیکہ اس قسم کے کئی لطیفے اُن کے متعلق مشہور ہیں۔

زندگی کا ایک رُومان:۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مومن کے ہمراز و شاگرد دہلی "صاحب جی" کے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

"نام امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی بتقریب مداوا با مومن خاں کاوش فتادہ است چند کارہا درد مداوا بود۔ مثنوی قول غمیں نام کہ از مصنفات خاں معزے الیہا ست شرح نسخۂ حسن و جمال ہماں موزوں قد است" دوسری بات جو اُن کی مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مومن کی حیات معاشقہ میں صرف ایک حادثہ پیش آیا ہے۔ کہ محبوب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور مثنوی میں اس کا ماتم کیا گیا ہے بلکہ اس سے بھی دل کو تسلی نہ ہوئی۔ تو ایک دردانگیز مرثیہ بھی لکھا جس کے ابتدا میں لکھا ہوا ہے۔ کہ "ترکیب بند بمضمون مرثیہ حور و ملک شیم حصلی وصالحانی جنات النعیم" اس عبارت کے آخری ٹکڑے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی ذمنی معشوق کا

مرتبہ نہیں ہے۔ اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ مثنوی میں جو واقعات قلمبند ہوئے ہیں اُن
کے امر واقعہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں نہ صرف زیب داستان کے لئے بیان کیا
ہے۔ بلکہ اُن کی آپ بیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک اچھے اور کامیاب غزل گو شاعر کا عاشق ہونا ضروری
ہے۔ چنانچہ اکابر غزل گو اور مشاہیر عشقیہ شاعری اپنے عہد کے دردِ دل رکھنے
والے عاشق تھے۔ جن کے تاریخی شواہد یا تو خود اُنکی تصنیفات میں پائے جاتے
ہیں یا اوراقِ تاریخ میں تلاش کرنے سے بآسانی مل سکتے ہیں۔
سعدی، حافظ، خسرو، عرفی۔ جامی فارسی شاعری کے ابوالآباء تھے۔ جنہوں نے
سعدی کی گلستاں باب پنجم کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اُن کی نظر سے شیخ سعدی کے واقعات
عشقیہ بھی گذرے ہوں گے۔ فرماتے ہیں:
"در عنفوان جوانی چنانکہ افتد دانی۔ با شاہدے سرے وسرّے داشتم بحکم آنکہ حلقے
داشت طیب الادا و خلقے کالبدر اذا بدا"
دوسری حکایت میں پھر اپنے ایک دوسرے عشقیہ راز کی یوں پردہ داری فرماتے ہیں
"یاد دارم کہ در ایام جوانی گذر داشتم در کوئے و نظر بہ روئے"
اس کے بعد کڑکڑاتی دھوپ میں کوچہ جاناں میں پہنچنے کا واقعہ بیان فرماتے
ہیں اور پھر یہیں تک نہیں بلکہ اپنی محبوبہ کے حسن بدیع اور جمال غریب کا یوں اظہار
کرتے ہیں:
"ناگاہ از ظلمت دہلیز خانہ روشنائی بتافت یعنی جمالیکہ زبان فصاحت
از بیانِ صباحت اُو عاجز آید چنانکہ در شب تارے صبح بر آید۔ آبِ حیات از ظلمات

بدر آید۔

آپ کو محبوب کے ہاتھوں سے پانی ملتا ہے۔ اس وقت آپ سرشارانہ طریقہ سے تنح آپ اور معشوق کے پسینہ کی تعریف کرتے ہیں۔

"قدحے برف آب درے دست گرفتہ و شکر دراں ریختہ و بحرق آمیختہ نہ دانم کہ بہ گلاب مطیب کردہ بود یا قطرہ چند از گل روئش دراں چکیدہ فی الجملہ شراب از دست نگارینش برگرفتم و بخوردم و عمر از سر گرفتم" اس کے بعد فرماتے ہیں ہماری تشنگی جس سے محبوب نے ایک پیالہ شربت دے کر مجھے آسودہ کرنا چاہا تھا۔ وہ پانی کو پی جانے پر بھی بجھنے والی نہیں یعنی یہ تشنگی ہجر کی تشنگی ہے جس سے آسودگی اس وقت میسر ہو گی جب وصل میسر ہو جائے۔

ظلماءُ بقلبی لا یکادُ لیب بخہ   دلشفت الزلال ولونذ نہب بحوا

اسی طرح خواجہ حافظ کی عشقیہ ترانہ سنجی آپ کے دیوان کا مطالعہ کرنے والے کسی طرح فراموش نہیں کر سکتے۔ جناب خسرو دہلوی کا واقعہ عشق عہد غلاماں کی عشقیہ داستانوں میں ایک ایسی شہرت رکھتا ہے جسے تاریخ نے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مولینا جامی کی سنجیدہ زندگی نے سعدی، حافظ، خسرو کی طرح کلام میں شوخی نہیں پیدا ہونے دی مگر آپ کا کلام راز محبت کو پردۂ کتمان میں نہ رکھ سکا۔ فرماتے ہیں:

مشغول عشق داد جامی   از شغل جہاں فروغ مارا

ز عشق تو بہ ز مقصود من بود جامی   خدا چہ بہر ہمیں کار آفرید مرا

اب ہم مومن کی شہرہ آفاق مثنوی کا وہ ٹکڑا درج کرتے ہیں جس کے اندر حقیقت میں انہوں نے اپنی سرگذشت عشق اور واقعات دردِ دل کو بہت صاف اور دلنشین انداز میں بیان کر دیا ہے جو سچ پوچھیے تو انکی زندگی کا بہت بڑا شاہکار ہے۔

ایک چندے یہی اوقات رہی   روز پہروں کی ملاقات رہی
واں سے اک طرح بہلتا تھا دل   کہ ہوئی اسمیں بلا اک نازل
کہیں باہر سے کوئی واں آیا   گھر سے بیٹھے ہی وہ مہماں آیا
سنتے ہی اور کسے آنے کی خبر   پردے کے واسطے آیا باہر

اتنے میں دل جو مرا گھبرایا   جی میں کچھ سوچ کے میں گھر آیا
دوسرے دن جو سوا گھر سے واں   جانب کوچہ رشک بستاں

الغرض جب میں وہاں جا پہنچا   تازہ پیغام اجل آ پہنچا
دم لبوں پر نہ کہ دم دینے لگے   تلخکامی کے مزے لینے لگے
دام الفت میں گرفتار ہوئے   پائے بند ستم یار ہوئے
یار کچھ آشفتہ سری نے مارا   کچھ مجھے چارہ گری نے مارا
کی پریشانی نے بری تدبیر   کہ ہوا دم میں احوال تغیر
ہو گیا جنس شناسی سے جنوں   سنو حال دل دیوانہ کہوں
صاحب خانہ نے بعد اکرام   بہ تغیر ادانہ کیا مجھ سے کلام
کہ یہاں عید محرم ہیں بہم   کل سے کیا کیا طرب و غم ہیں بہم

یعنی وارد ہے وہ مہمان عزیز — جس کے قرباں مری جان عزیز
لیک بیمار پریشاں احوال — نہ وہ جلوہ نہ وہ رونق نہ جمال

آپ کچھ چارہ گری کیجیے غرض — نبض دیکھی کہ ہو تشخیص مرض
میں نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا — ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا
آفت تازہ جو جاں پر آئی — یہ غزل اپنی زباں پر آئی

کیا لگا وحشت دل آرام سے ہاتھ — دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
کس کے ہاتھ سے لگا تھا کہ جدا — نہیں ہوتا دل ناکام سے ہاتھ
ہاتھ دیتے تو ہو اب ہاتھ میں پر — کان پر رکھے گا کچھ نام سے ہاتھ
کیا کہوں آہ کہ بقول مومن — دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

سارے دن تو رہے ہم صحبت یار — جب ہوئی شام تو اٹھے ناچار
اس کے کوچہ سے نہ اٹھتا تھا قدم — بیٹھے جاتے تھے ہر اک گام پہ ہم
واں سے آنے کی کہاں طاقت تھی — کیا کہوں آہ عجب حالت تھی
دل میں جب ہوک اٹھی بیٹھ گیا — پاؤں اٹھا بھی تو جی بیٹھ گیا
عجب احوال سے گھر تک پہنچا — خون دل دیدۂ تر تک پہنچا
گھر میں آیا تو مرے ہوش کہاں — دل وہاں جان وہاں دھیان وہاں

شوق فرمائے کہ ہاں پھر چلیے | جی میں یہ آئے کہ واں پھر چلیے
دل بیتاب کو پھر تھام لیا | بیقراری ہی میں آرام لیا

بوئے گل لائی صبا بستاں سے | یعنی اک نامہ یہ آیا واں سے
واہ کیا جوں وہ طلسم افسوں | ہاتف آیا یہی گنج مضموں
کہ تمہارے بھی عجب ہیں حرکات | ایسے ناداں کہ سمجھتے نہیں بات
کیا مناسب تھے یہ بیباک سخن | نامناسب تھے یہ بیباک سخن
حرکت اچھی نہیں بدنامی کی | یہی باتیں تو ہیں ناکامی کی
پاس رسوائی کا گہ اپنی نہ ہو | دیکھیو تم مجھ کو رسوا نہ کرو
بسکہ ہوتا ہے محبت میں اثر | مجھ کو سب درد کی تیرے ہے خبر
دل مشتاق تپاں ہے یاں بھی | زینت لب پہ فغاں ہے یاں بھی

اب گیا واں تو تکلم بر لب | دشنہ در جان و تبسم بر لب
پھر وہی اگلی سی شیریں سخنی | دل میں سو زخم و لے خندہ زنی
اوروں سے حرف دلآویزانہ | آشنا سے سخن بیگانہ
یوں ہی با عشرت و عیش و آرام | جبکہ گذرے ہمیں کچھ اور ایام
بعد چندے یہ فلک ناہنجار | بد چلن، بد روش و کج رفتار
جمع احباب پریشاں گرداں | گہ دشت افزائے بیاباں گرداں
دیکھ واں روز کا جانا میرا | بیٹھنا ہنسنا ہنسانا میرا

راہ بیداد کی لی ظالم نے | چھوڑ دی راست روی ظالم نے
سر پہ اک آفت تازہ لایا | بدسلوکی سے مرے پیش آیا

یعنی واں کوچ کی اُن کے ٹھہری | ناگہاں کوچ کی اُن کے ٹھہری
جس گھڑی ہم تلک آئی یہ خبر | چھا گئی بے خبری سی دل پر
اک غلو ہوش پہ بیہوشی کا | عالم اک اپنی فراموشی کا
خود فراموشی و غفلت کوشی | بیخودی اور بے خبری بے ہوشی
اس میں پیغام یہ آیا واں سے | ترجماں لعل لب جاناں سے

جی میں آ جائے تو آ جاؤ یہاں | آن کر شکل دکھا جاؤ یہاں
اور اس وقت بھی گر آپ نہ آئے | ہم کہاں اور کہاں تم پھر آئے
سن کے یہ بات میں با حال تباہ | بیخودانہ ہوا اس کے ہمراہ
پا بہ شوق کہاں تک پہنچا | وہ رہی جس جائے وہاں تک پہنچا
کیا کہئے ڈھب سے ملاقات ہوئی | کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی
مل کے حیرت زدگان بیکس | دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خونفشاں لب پہ دو دو آہیں باہم | حسرت آلودہ نگاہیں باہم
گہ جو ہرگز نہ تھی تاب کلام | پہ یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو | مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اوروں سے لگا لیجیو جی | نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی

ہاں اگر فکر ہو تو تم کو ہو — رنج و اندوہ ہو تو ہم کو ہو

کم بری آہ ہماری خو ہے — ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے

خیر رہنا ہوا اب تک اپنا — اب وطن تم کو مبارک اپنا

تم رہو خوش کبھی اقبال کے ساتھ — ہم چلے حسرت و ارماں کے ساتھ

کہہ کے دل رنج و بلا کو سونپا — تم کو تو ہم نے خدا کو سونپا

کہہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی — ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی

ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے — با دل مضطرب و مضطر آئے

کیا کہوں کیسے گذاری وہ رات — گذری کس حال میں ساری وہ رات

کس سے یہ صدمہ سہا جاتا ہے — کس سے یہ حال کہا جاتا ہے

جو ہو دلدادہ سمجھ لے آپ ہی — کار افتادہ سمجھ لے آپ ہی

بات یہ ہے کہ اس زمانے میں زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ رندی و مذہبیت ایک انفرادی چیزیں تھیں ان میں اتنا تضاد نہیں تھا جتنا آج نظر آتا ہے۔ زندگی عشق مجازی سے شروع ہوتی تھی۔ اور بعض صورتوں میں وہ عشق حقیقی کا زینہ بن جاتی تھی۔ مومن نے اپنی جوانی کا زمانہ ہوسناکی میں گذارا۔ چونکہ وہ نہایت خوبصورت جامہ زیب، خوش گلو، خوش وضع اور عاشق مزاج آدمی تھے۔ دلی ان کی جولان گاہ تھی اس لئے انہوں نے اس میدان میں خوب داد عیش دی۔ جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہو گئی تو انہوں نے ہر قسم کی بری باتوں سے اجتناب کر لیا۔ اور مذہب کے پورے معتقد ہو گئے یہاں تک کہ اپنی پختہ مذہبیت اور تدین میں خاص شہرت حاصل کی۔

وفات

ہندوستان کے اس مایۂ ناز شاعر نے جو اُردو شاعری اور تغزّل کا امام تھا۔ صرف اکیاون برس کی عمر پائی۔ کوٹھے سے گرنا موت کا باعث ہوا جس کی تاریخ شاعر نے خود کہی "دست و بازو بشکست" اور حکم لگایا کہ پانچ دن۔ پانچ مہینہ۔ پانچ برس کی مدت میں مر جاؤں گا۔ وہی ہوا کہ پانچ مہینے کے بعد ۱۸۵۱ء مطابق ۱۲۶۸ھ میں اس دُنیا کو خیرباد کہا جس کا ماتم درد انگیز لہجہ میں مرزا غالب نے اپنی ایک رباعی میں یوں کیا ہے

شرط است کہ بہرِ دل خراشم ہمہ عمر   خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن   چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

ان کے ایک شاگرد نے تاریخ وفات "ماتم مومن خاں" سے نکالی۔ دلّی دروازے کے باہر میہدیوں کے جانب غرب حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ کے مقبرے کے پاس سپردِ خاک کئے گئے۔

مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا۔ ایک روایت آبِحیات سے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے دو برس بعد خواب میں دیکھا کہ ایک قاصد نے آ کر خط دیا۔ کہ مومن خاں کا خط ہے۔ انہوں نے لفافہ کھولا تو اس کے خاتمہ پر ایک مہر ثبت تھی جس پر "مومن جنتی" لکھا تھا۔ اور خط کا یہ مضمون تھا کہ آج کل میرے اہل و عیال پر مکان کی طرف سے بہت تکلیف ہے تم انکی خبر لو۔ صبح کو نواب صاحب نے دو سو روپے ان کے گھر بھیجے۔ اور خواب کا مضمون بھی لکھا۔ ان کے صاحبزادے

احمد نصیر خاں، کا بیان ہے کہ فی الواقع اِن دنوں ہیں ہم پر مکان کی نہایت تکلیف تھی۔ برسات کا موسم تھا۔ اور سارا مکان ٹپکتا تھا۔"

تصنیفات

مومن کی یادگار میں اُردو کلیات کے علاوہ ایک انشائے فارسی اور دیوان فارسی بھی ہے جنہیں حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا۔ یہ کتابیں ۱۸۴۶ء سے قبل مطبع سلطانی میں چھاپی گئی تھیں۔ مومن کا اُردو کلیات نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے مرتب کیا۔ پھر میر عبدالرحمان آہی خلف میر حسین تسکین نے از سرِ نو ترتیب دے کر شائع کیا۔ اور یہ نسخہ کئی بار چھپ چکا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مومن نے طب پر بھی بعض رسائل لکھے جو اب نایاب ہو چکے ہیں۔

اولاد

مومن کی شادی خواجہ محمد نصیر صاحب رنج کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ رنج کے تذکرہ میں صاحب طور کلیم نے لکھا ہے کہ "میر محمد نصیر محمدی خلف میر کلاں نبیرہ و سجادہ نشین میر درد علیہ الرحمتہ۔ مومن یاد نسبت خویش دومادی داشت" رنج کا ایک شعر ہے

دل یہ جس کے لئے پہلو میں نہاں رہتا ہے یوں سُنا ہے کہ اسے بھی خفقاں رہتا ہے

مومن کی اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی یادگار تھیں بیٹے کا نام احمد نصیر خاں تھا۔ جن کے فرزند محمد نصیر خاں ا۔ رصاحبزادی عزیز بیگم تھیں مومن مرحوم کی بیٹی محمدی بیگم کا عقد مولوی حمید الغنی وکیل سے ہوا تھا پر رنڈاپا ہوگیا۔ یہی صاحبزادی تھیں جسکی تاریخ ولادت مومن نے اس طرح کہی تھی۔

ناز کرنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دخترِ مومن

ان کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا۔

ضیاء احمد بدایونی کے مقدمہ دیوان مومن سے پتہ چلتا ہے کہ آج بھی انکی اولاد میں سید ناصر حبیب صاحب اور انکی دختر نیک اختر کنیز فاطمہ صاحبہ موجود ہیں

تلامذہ

مومن نے اپنے پیچھے شاگردوں کی بھی ایک کثیر جماعت چھوڑی جن میں بعض نو استادان فن کے مرتبہ پر پہنچے۔ مثنوی پنجم الموسوم حنین مغموم غم میں بعض کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

کون ہے شاگرد وہ استادِ فن　　　بے سخن ہے دلربا جن کا سخن
وحشت و مضطر کرم تسکین و یاس
....
اکبر و عظمت سرافراز سخن
....
شیفتہ بسر دفتر اہل قلم　　　نکتہ خاطر نشاں جن کا رقم

"نگار" مومن نمبر کے مقالہ نگار امتیاز احمد صاحب علیگ مرحوم نے کسی قدر تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں انہیں کی تحقیق کے مطابق ان کے حالات و کلام درج کئے جاتے ہیں۔

آشفتہ

حکیم سید منور علی خلف سید علی نواز رضوی سادات بارہا سے تھے دلی ہی میں رہتے تھے۔

بہت روئے تو اپنی جان کھودی　　　کسی کا ہم نے تلدارک لیا کیا
سنا تھا ہم نے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے　　　کئی دن ہو گئے اسکو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے

آہی

میر عبدالرحمٰن خلف میر حسین تسکین مومن خاں کے داماد اور اُن کی کلیات کے مرتب ہیں

اٹھ کہیں ہے آمد آمد اس ستمگر کی وہاں
اہل محشر مجھ کو یہ مژدہ سنا کر لے گئے

ہے غلط معلوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر
شہر میں یاں کسی کا تو گزر یاں ہوتا

قلق

حکیم مولا بخش میرٹھی۔

بے اعتباریوں نے مری تجھ کو کھو دیا
ہے مجھ میں جو نہاں وہی تیرا ظہور تھا

نہ ہو آرزو کچھ یہی آرزو ہے
فقط میں ہی میں ہوں تو پھر تو ہی تو ہے

محبت میں کہاں شرکت گوارا
اٹھائے نالہ کیوں تہمت اثر کی

دیکھو ستم ظریفیٔ دردِ دل و جگر کی
اک آسماں کو پھونکا اک آسماں بنایا

فصل بہار اپنی گذری ہے یوں ہماری
یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

کچھ تماشا ہے کھیل ہے کیا ہے
اک زمانے کو قتل کر بیٹھے

بیتاب

نواب عباس علی خاں رامپوری۔

دیا دسے روز جزا کے بھی رہو نگا محرم
یہ نظر آتی ہے طول شب ہجراں مجھ کو

سحر نہ دیکھنی ہم کو نصیب ہو یارب
شب فراق میں اپنی یہی دعا ہوگی

بیمار

نام شیخ علی بخش۔ سنبھل ضلع مراد آباد کے رہنے والے ہیں "طورِ کلیم" "بزمِ سخن"

"خمخانہ جاوید" مصحفی اور غفلت کے شاگرد بتلائے گئے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی تحقیق ہے کہ بیمار قدرت اللہ شوق کے شاگرد ہیں۔ مولانا نیاز فتح پوری نے شاہ رامپوری کے تذکرے میں انہیں مومن کا شاگرد دیکھا ہے۔

کون پرساں ہے حال بسمل کا | خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا
لب جو کون سیر کو آیا | موج منہ چومتی ہے ساحل کا
سانس آہستہ لیجیو بیمار | ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

تسکین

میر حسن نے ۱۲۶۶ھ میں وفات پائی۔ مومن خاں کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

کوچۂ یار میں میں نے تسکین | پاؤں اٹھاتا تھا کہ سر یاد آیا
تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق شہادت ہو | کمبخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا
تسکین نے لیکے نام ترا وقت مرگ آہ | کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں
قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی | بات تو کرنے دے اس سے دل بیتاب مجھے
فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں | تجھ کو یہ پایا تیری رفتار سے
اندر عالم ہے کہ ان سے بھی دو | صبر سے مرنے کی دعا مانگے ہے
ابھی اس راستے گذرا ہے کوئی | کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

قمر الدین

مرزا غلام فخر الدین مرزا صاحب کے بھائی تھے کبھی کبھی مومن سے اصلاح لی ہے

اب ہے کیا باقی جو کاوش ہے تیری دست جنوں
چاک داماں ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

برق

قاضی نجم الدین ابن سراج الدین سکندر آبادی

اے برق تیز دستی وحشت کو دیکھنا — دامن کو سیتے سیتے گریباں نکل گیا
وہ بھی نہ رہا جوشِ محبت میں الٰہی — پہلے جو میری آہ میں تھوڑا سا اثر تھا
وحشی نے تیرے خاک اڑائی جہاں تلک — ملتا نہیں زمیں کا پتہ آسماں تلک
حرم و دیر کے جھگڑے تیرے چھپنے سے پڑے — ذا گر پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے

راحت

مرزا محمود بیگ دہلوی۔

ہم سے تو وہ بھی چھوٹے اور دل شیدا چھوٹا — یاد کس کس کو کریں خبر جو چھوٹا چھوٹا

راسخ

سعادت علیخاں شوخاں دہلی۔

ہوں تو آنکھوں ہی پر نہیں پر سمہ — سرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

سالک

مرزا قربان علی بیگ سالک غالباً مومن کی حیات تک خان مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اسکے بعد غالب کے شاگرد ہو گئے۔ صاحب دیوان ہیں

واں دخل وہم کو نہ گذر ہے خیال کا — اچھی جگہ ہے دل کو بھروسہ وصال کا
دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی — بے وفا تھی اسے لے کے پشیماں ہوگا۔

یوں عمر گذاری تری فرقت میں کہ ہر دم
جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا

جب تھک کے تری راہ میں بیٹھے تو بحالِ
جو کھوئے ہوئے ہیں وہی کچھ پائے ہوئے ہیں

ہم بیٹھے ہیں یوں منتظر اس راہ گذر میں
گویا کہ اسی شمع کے ٹھہرائے ہوئے ہیں

صاحب

نام امنۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی صاحب "گلشن بے خار" نے لکھا ہے کہ "بتقریب بلادا با مومن خاں کاوش افتادہ ما ہے چند کار باد ..... دو والہ مثنوی قول جمیں، نام کم از مصنفات خاں معزی الیہ است۔ شرح نسخہ حسن و جمال ہماں موزوں قد است۔ القصہ بفیض شان دلش بشعر و شاعری میل کردہ از موزونی قامت بموزونی طبع گردانیدہ واز آرائش زلف پیچاں بموشگافی اشعار پیچیدہ از دست۔"

گنہ کیا صنم کے لگانے میں زاہد
خدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا

کھلے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند
نہ گھر رکھے نسیم سے کہہ دو قبائے گل

جو خط جبیں کا رے کاتب سے اسی کو
دکھلا تو مرا نامہ اعمال الٰہی

شیفتہ — نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و شیفتہ

لے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا
سمجھے جو گرمی ہنگامہ جلانا دل کا

کس منہ سے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا ہے

کہتا تھا وقت نزع کے ہر ایک سے شیفتہ
دنیا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر

آشفتہ زلف چاک قبا نم باز چشم
ہیں صحبت شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز

اے ناب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز

باہنے جوش غنچہ پیہم کو تھام لے
یا کہیے میں بھی نالۂ شورش ادا کروں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ ‏ طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

کچھ اور بیدلی کے سوا آرزو نہیں ‏ اے دل یہ یاورکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ‏ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اک نیم باز بس ہے ہمارے ہلاک کو ‏ کچھ بھی نہ کیجیے دیکھ کے بس مسکرائیے

ظہور

ظہور علی ابن مولوی فتح علی ہریانوی مومن سے کچھ دنوں تک اصلاح لی ہے

اے اشک میرے دیدۂ نمناک سے باہر ‏ جاتا ہے کدھر تو تو مرا لخت جگر ہے

عظمت

پیر عظمت اللہ ولد پیر قدرت اللہ ‏ دہلوی

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ ‏ کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں

شورش

نام غلام احمد

نامہ جو بنا لایا ہے قاصد تو صنم کا ‏ الماں نہ کھونا کبھی مایوس کرم کا

کیا جانے عدو خون جگر پینے کی لذت ‏ شورش سے مزا پوچھئے تحناب الم کا

صغیر

مہاں جان دہلوی

کہتے ہوئے جان جائے تری اور تمھیں ہو جان ‏ ہے ہے خدا نخواستہ یہ تم نے کیا کہا

ہوا ہو سہو تو پھر خوب یاد کر لیجئے — کہ رہ نہ جائے کوئی جور آسماں کیلئے

قیصر

مرزا خدا بخش نواسہ شاہ عالم

تو لطف کرے یا نہ کرے خوش ہو کہ ناخوش — اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں

کاظم

کاظم علی ہند اور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔

اے طفل اشک ہم تجھے آنکھوں میں یوں رکھیں — اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کرے

کرم

شیخ غلام علی ضامن دہلوی کچھ دنوں حیدر آباد میں رہے اور بھوپال میں انتقال کیا۔

ہاتھ دھو دے گا مرا اور ترا داماں ہوگا — چاک جب صبح قیامت کا گریباں ہوگا

سہو ہیں گے جور جفا نفرت و تاب و توان تلک — لیکن یہ پوچھتے ہیں تجھی سے کہاں تلک

نسیم

مرزا اصغر علی نسیم نے کچھ دنوں اصغر بھی تخلص کیا۔

جب دیکھئے قرار نہیں ایک شکل پر — میرا سا اب تو حال ہوا روزگار کا

جب اور کسی پہ کوئی بیداد کر گئے — یہ یاد رہے ہم کو مصیبت یاد کر گئے

کچھ دیتی نقاب سے نیچی نگاہیں — کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز — یہ ارادے ایک مشت خاک پر

نام میرا سنتے ہی شرما گئے — تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

سفر ہے دشوار خواب کب تک بہت بڑی منزل عدم ہے
نسیم جاگو کمر کو باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

وحشت

میر غلام علیخاں وحشت ابن میر فرحت اللہ خاں مرادآبادی۔

دل میں عدو کے بڑھ گئی کیا الفت آپکی
کچھ ان دنوں میں پہلے سے لطف و کرم نہیں

میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں
مر گیا وحشت جاں باز تری جان سے دور

کیوں نہ باطل سمجھوں اقرار وفا
سحر ٹپکے ہے تری گفتار سے

یاس

خیرالدین دہلوی

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

یاس کا مصرع اولیٰ یوں تھا۔

ہجر میں کیونکر پھروں ہر سو نہ گھبرایا ہوا

شربت وصل نہ پینے دو نہ سم کھانے دو
کیا قیامت ہے نہ جینے دو نہ مر جانے دو

خاکہ

رجحانات
مومن کی شاعری کے داخلی عناصر
تغزل
نفسیات
طنزیات
جمع اضداد
قنوطیت
خمریات
مومن کا اسلوب بیان
سادگی
محذوفات

خصوصیات

نازک خیالی
تشبیہات و استعارات
الفاظ و محاورات
جدت تراکیب
مقطع
شخصیت کا اظہار

اصناف

قصائد
مثنویاں
رباعیات
مرثیہ
واسوخت
تضمین
سہرے اور تاریخیں
پہیلیاں

موازنہ

مومن اور فارسی شاعری
مومن اور عربی شاعری
مومن اور ہندی شاعری
مومن اور مغربی ادبیات

مومن کا تقابل اردو شعراء سے
میر و مومن
غالب و مومن
ذوق و مومن
جرأت و مومن
ناسخ و مومن

فارسی
مومن کی عدم مقبولیت کے اسباب
کلام مومن کے بعض نقائص
کلام مومن کا اثر شعرا
مومن، مشاہیر کی نظر
کتابیات

تغزل | غزل کے لغوی معنی اس قدر مشہور و عام ہو چکے ہیں کہ اُسکے اظہار کی ضرورت نہیں، وہ اصل میں عربی زبان کا لفظ ہے۔ مگر ایرانی شاعروں کی اصطلاح ہے۔ ایران کے قدیم مصنفوں کی جو کتابیں زمانے کی دستبرد سے بچکر ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم کتاب جسمیں غزل کی تعریف ملتی ہے۔ رشید الدین وطواط کی "حدائق السحر فی دقائق الشعر" ہے یہ کتاب سنہ ۵۵۰ھ کے قریب یعنی آج سے آٹھ سو برس پہلے لکھی گئی۔ وطواط مصطلحات شعرا کے ذیل میں تشبیب، نسیب اور غزل کو ہم معنی اصطلاحیں قرار دے کر لکھتا ہے

"تشبیب صفت حال معشوق و حال خویش در عشق او گفتن باشد۔ و این را نسیب و غزل نیز خوانند۔ اما مشہور و مستعمل آنست در میان مردم کہ صفت ہرچ کنند در اول شعر و ہر حالے را کہ شرح دہند الا مدح ممدوح آنرا تشبیب خوانند" یعنی معشوق کا حال اور اس کے عشق میں اپنا حال بیان کرنا تشبیب ہے۔ لیکن لوگوں میں مشہور اور مستعمل یہ ہے کہ جس نظم کے پہلے شعر میں پریشاں حالی کا ذکر کریں اور پھر ممدوح کی مدح کے سوا جو حال چاہیں بیان کریں۔ اس کو تشبیب کہتے ہیں اور اسی کو نسیب اور غزل بھی کہتے ہیں اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ قدیم ایرانی شعرا کے نزدیک غزل کے منفرداً مضامین محدود نہیں تھے۔ وہ غزل میں مدح ممدوح

کے سوا سب کچھ کہنا جائز سمجھتے تھے۔

حدائق السحر کی تصنیف کے ساتھ ستر برس بعد شمس الدین محمد بن قیس رازی نے اپنی کتاب المعجم فی معائر اشعار العجم" لکھی جسمیں غزل کے متعلق یوں اظہار خیال کیا گیا

"غزل در اصل لغت حدیث زناں و صفت عشق بازی با ایشاں و تہالک در دوستی ایشاں است...... و بعضے اہل معنی فرق نہادہ اند میان تشبیب و غزل.....
و بیشتر شعرائے مفلق ذکر جمال معشوق و وصف احوال عشق و تصابی را غزل خوانند و اغراضے کہ مقدمہ مدح یا شرح حالے دیگر باشد آں را تشبیب گویند"

یعنی لفظ غزل کے معنی ہیں عورتوں کا ذکر کرنا۔ اِنکے عشق کا دم بھرنا۔ اور انکی محبت میں مرنا۔ بعض اہل معنی تشبیب اور غزل میں فرق کرتے ہیں اور زیادہ با کمال شعرا جمال معشوق کے ذکر احوال عشق اور محبت باہمی کے بیان کو غزل کہتے ہیں اور ان غزلوں کو جن میں کوئی اور حال بیان کیا جائے، یا جو کسی کی مدح کا مقدمہ ہوں تشبیب کہتے ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ محبت یا عشق نام ہے ایک شدید قسم کے احساس پسندیدگی کا۔ اگر یہی جذبۂ پسندیدگی افراد نوع انسانی میں سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ "محبت" کہلاتا ہے۔ لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے۔ وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت ماں، بھائی، اولاد، اعزہ و احباب سے بھی پیدا ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں بن سکتی اس کا تعلق ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں جنسی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔" اس لحاظ سے غزل کا دائرہ دنیائے شاعری میں بہت محدود ہے اور شاعر محبت جنسی کے داعیات

سے علیحدہ ہو کہ کوئی اور میدان اختیار نہیں کر سکتا۔

چنانچہ مولانا نیاز فتحپوری نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"شاعری کے تمام اصناف میں غزل کوئی جس قدر بلند ہے کوئی نہیں، روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ تو صرف غزل ہے۔ اور اسی بنا پہ کہا جاتا ہے۔ کہ غزل کا ارتقاء تصوف ہے۔ مگر تصوف سے مراد وہ علوئے فطرت وہ عروج روحانیت اور وہ استغلاء تصور ہے جہاں انسان مادیت سے گذر کر اپنے مرکز اصلی یعنی باتی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن میں امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے۔ پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے۔ وہ ابتدا ہی اس منزل میں پہنچ جاتا ہے جو منزل لب بام ہو اکرتی ہے شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے۔ اور دنیا کی ندیدہ وجم ملیر میں بھی اس نغمہ سرمدی کو سنتا رہتا ہے۔ جو ہر دم اس کو اپنی لذت سے بیخود رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور بہت کم ایسے ہیں جو بیدل کے مرتبہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوں لیکن ایک فطری وذہنی شاعر خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل میں کیوں نہ ہو اس سوز وگداز اس درد و تاثیر اس غذوبت بیان، اس حلاوت زبان، اور اس حقیقت وصداقت سے معرا نہیں ہو سکتا جو صرف فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔"

مومن نے اپنا دائرہ تخیل بہت محدود کر دیا ہے۔ اسکی شاعری اسی دنیا کی شاعری ہے اور اسی دنیا کے انسانوں سے تعلق رکھتی ہے اور اس نے اپنی شاعری کے اندر

اسی دُنیائے آب و گِل کے جذبات و احساسات بیان کئے ہیں۔ کیونکہ اس نے اسی دُنیا کا عشق کیا ہے اور اسمیں جتنے تجربات تلخ و شیریں ہو سکتے ہیں۔ وہ سب اس نے حاصل کئے ہیں۔ وہی ہجر و وصال کی مادی کیفیات، وہی شکوہ شکایت، وہی رقیب کا کھٹکا، وہی التجائیں، وہی تدبیریں۔ الغرض وہ تمام جذبات جو عناصر محبت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جو اس گوشت پوست کی دنیا میں گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں سب کے سب مومن کے ہاں پائے جاتے ہیں فلسفہ، تصوف، سائنس وغیرہ مسائل کی جھلک ان کے کلام میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ بقول نیاز صاحب "رنگ تغزل میں مومن کا کلام اس عنصر تغزل سے بالکل پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے" اس قسم کے مضامین اگر کہیں ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ تو محض برائے نام۔ اور جو الشاذ کالمعدوم کے برابر ہیں۔ ورنہ حقیقت میں مومن کا کلام شروع سے آخر تک رنگ تغزل کا حامل ہے اور مومن نے غزل کے حقیقی مفہوم "راز گفتن بہ معشوق" کا حق ادا کر دیا ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے۔

مومن بہشت و عشق حقیقی تمہیں نصیب

ہم کو تو رنج ہو جو غم جاوداں نہ ہو

مصنف کاشف الحقائق کا خیال بالکل صحیح ہے کہ "مومن کے کلام میں کوچہ گردی کی بو آتی ہے" لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا معشوق جنس کم اور زمے تعلق ضرور رکھتا ہے۔ مگر اُسکی نوعیت گوئی اور معاملہ بندی اُردو کے دیگر شعراء کے مقابل میں کہیں بلند و ارفع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اسلوب کی ندرت اور پاکیزگی سے اپنے کلام پر ابتذال اور عریانی کا دھبہ بالکل نہیں آنے دیا۔ گو کہ اس کا

محبوب بھی جرأت و انشاء کی طرح بازاری ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت و انشاء کا عشق سراسر بازاری ہے اور مومن کا نقطۂ خیال اس بارے میں بہت بلند ہے۔ حتیٰ کہ اس تک رسائی بھی دوسرے شعراء کی محال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محبت کا وہ جذبہ جس پر غزل کی بنیاد قائم ہے۔ اپنے مقصود و مدعا کے لحاظ سے گو غیر فطری نہ ہو لیکن اس کا غیر سنجیدہ ہو جانا یقینی ہے۔ اگر اس کے اظہار میں احتیاط نہ کیجائے۔ کیونکہ بلندی سخافت سب الفاظ و انداز بیان پر منحصر ہے انداز بیان ہی وہ چیز ہے جس سے مخاطب کو متاثر کیا جاتا ہے اور گفتگو کا لب و لہجہ پیدا کرنا مخصوص الفاظ، مخصوص تراکیب سے ہی ممکن ہے۔ مومن کا کمال یہی ہے۔ کہ اس نے جو کچھ کہا ہے۔ بہت خوب کہا ہے۔ مومن کے یہاں عشق و محبت کی گرمی اور سوز و گداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ مگر اسکے ساتھ ساتھ اسکے لطیف اشارے۔ کنائے۔ اسکی شیریں ترکیب الفاظ، اسکے انداز بیان کی جدتیں، اسلوب ادا کا تنوع، اور باوجود عشق بازاری کے اُن کے خیالات کی بلندی اپنا جواب نہیں رکھتی اور طرز ادا کا تو حقیقت میں مومن بادشاہ ہے جہاں تک نفس شاعری اور غزلگوئی کا تعلق ہے مومن کا مرتبہ اس لحاظ سے اُردو کے تمام غزل گو شعراء میں بلند ہے اور مشکل سے اس کا کوئی جواب ملے گا۔

شاعری کی رُوح خواہ کچھ ہو لیکن اُس رُوح کو ہم جس جسم کے اندر دیکھتے ہیں وہ صرف الفاظ کا رکھ رکھاؤ ہے۔ اور اگر اسکے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا جس طرح ایک مصور کے حسن ذوق کا پتہ چلا لینے کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے کس زاویہ سے تصویر لی ہے۔ اسی طرح ایک شاعر کے حسن بیان پہ حکم لگانے کے لئے ہم کو

یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس خیال کا خطِ رفتار کیا ہے، اور اس نے اپنا تیر کس گوشہ سے چلایا ہے۔ آسکر وائلڈ کہتا ہے۔

"کسی تصنیف یا کتاب کے متعلق یہ بحث کرنا کہ وہ اخلاق کا درس دیتی ہے یا بد اخلاقی کا بالکل فضول اور لا یعنی سی بات ہے۔ اسکے متعلق صرف یہ بحث ہو سکتی ہے کہ وہ تصنیف کی حیثیت سے اچھی ہے یا بُری"

آسکر وائلڈ کی یہ رائے حملہ اصناف تصنیف پر حاوی ہو یا نہ ہو لیکن شاعر کے بارے میں یقیناً قابلِ عمل ہے۔ یہاں تو ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو ودیعت فطری ایک شاعر کو عطا ہوئی ہے اسکا استعمال اُس نے درست کیا یا نہیں۔

مومن کے بعض اشعار اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ گرفت ہوں تو ہوں مگر جہاں تک فن کا تعلق ہے اسکا ہر شعر مکمل ہے اور بلا شبہ وہ دُنیائے شاعری میں اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

مومن کا عشق باوجود مادی ہونے کے اس درجہ بلند افتادگی رکھتا ہے۔ کہ وہ اپنی ہر ناکامی کا شکار خود ہی بننا پسند کرتا ہے۔ اور محبوب سے کوئی بات ایسی نہیں کہنا چاہتا، جو شانِ عاشقی کے شایانِ شان نہ ہو عالم ہجر میں عاشقوں کا واویلا خاص چیز ہے لیکن مومن کا نقطۂ نظر اس بارے میں مختلف ہے چنانچہ کہتا ہے۔

"تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کبھی اپنی شبِ دراز میں

پھر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی زیادہ تکلیف برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا

وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

اسی طرح رقیب و دشمن کے متعلق جس جگہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ تو وہ بھی صرف اپنا ہی دل خون کرنے کی حد تک اور کسی جگہ بھی حدودِ عاشقی سے متجاوز نہیں ہوتا۔

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں

کس کے استقبال کو جی تن سے نکلا جائے ہے

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم

منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

ذکرِ اشکِ غیر میں رنگینیاں بوئے خوں آئی تری گفتار سے

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے

یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

مومن نے ہجر و وصل کے مضمون کے لیے جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے کم شعراء کے ہاں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اندازِ بیان کا اتنا تنوع مومن کے نازک خیال دماغ کا سچ پوچھیے تو معجزہ ہے۔ کہتا ہے

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہو گا مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہو گا

موت کے خیال سے دل کو سمجھا شبِ ہجر کاٹنا بھی کیا کم تھا۔ کہ اس کے لئے بھی امید کا شرمندۂ احسان ہونا پڑتا ہے۔

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہو گا

کہتا ہے یہ سب صحیح ہے کہ ہجر میں زندگی مصیبت ہو جائے گی لیکن بہر حال مرنے سے تو جینا آسان ہی ہے۔ دیکھیئے لفظ "مرنے" سے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔

شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر   سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھ کر

شب مہتاب تھی میں سمجھ گیا کہ وہ عدو کے گھر گئے ہوں گے۔ بُرا ہو شوقِ وصال کا کہ مجھے کہاں لے گیا۔

محوِ حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں   بلبلِ تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

عاشق حیران ہے۔ گویا وصال و ہجر سے بہت بلند ہے وہ اپنے خیال ہی میں محو ہے۔

منتظر رہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں   اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

جس ہجور کے لئے ہجر عادتِ ثانیہ بن گئی ہو۔ جس ہجور کے لئے وصل ستم ہو جائے خیال کیجئے اسکے ہجر کی مصیبتیں کتنی ہوں گی۔

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل

ظالم کہاں دکھاتا اثر میری آہ میں

ملاحظہ ہو کس انداز سے محبوب سے اپنے ایام فراق کی مصیبتوں کو بیان کر گیا۔ وہ مصیبتیں کتنی سخت ہونگی جن کو دیکھ کر غیر کو بھی رحم آگیا ہو۔

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا   مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

کہتا ہے ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا یعنی وعدہ وفا نہیں ہوا اور شب وعدہ شب وصل ہونے کی بجائے شب ہجر ہو گئی لیکن بالفرض محال قسمت میں لکھا تھا کہ وہ آتے تو ہم اُن پر اپنی جان قربان کرتے وہ نہیں آئے تو ہم غم سے مر گئے مرنا بہر حال تھا اس لیے اُن کا آنا اور نہ آنا دونوں برابر ہے۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے　　　ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہو گئے

مومن اپنے کو خاتم العشاق سمجھتا ہے اور ساری بلائیں اور تمام مصیبتیں اپنے اوپر اوڑھ لینا چاہتا ہے حقیقت میں مصیبت تو سب کا ساتھ دیتی ہے لیکن مصیبت کا ساتھ دینے والا عاشق کے سوا کوئی نہیں اس انداز بیان کو ملاحظہ کیجئے کہ مومن کو اپنی کے بجائے شب ہجراں کی فکر ہے

بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا　　　جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا۔

وہ وصل و ہجر میں بالکل فرق کوئی نہیں کرتا۔ اسکے نزدیک کیفیت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقت وصال

دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا

مومن کے اس ستم ایجاد کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

شب فراق کی انتہائی تکلیف سے مر جانا یا مر جانے کی آرزو کرنا بالکل قدرتی خواہش ہے اور اگر کوئی شاعر اسکے خلاف جائے گا۔ تو یقیناً فطری ادعا کیخلاف کرے گا لیکن ملاحظہ ہو مومن کس حسن کے ساتھ اس کی توجیہہ کرتا ہے۔

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں　　　کہ گو خوشی نہیں مرنے کی پر ملال تو ہے

شب وعدہ اپنی بیقراری کا کتنا موثر منظر کھینچتا ہے

کس کی خبر اب آئیں کس لئے ہے یہ بیتابی

کس لئے ہیں ہم ہر دم پھرتے آتے ہیں ادھر جاتے ہیں

کسی کے انتظار میں بیتابی کا اس طرح مظاہرہ بالکل فطری ہے اسی طرح دیکھئے

عاشق کی کتنی حسرتناک تصویر کھینچتا ہے۔

دمبدم روتا ہمیں چاروں طرف تکتا ہمیں　　کیا کہیں عاشق ہوئے یا بوگیا سودا ہمیں

وہ بعض جگہ معمولی سے معمولی بات کا اظہار کرتا ہے۔ تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اسمیں جودت و ندرت پیدا ہو جاتی ہے اور ذہن سامع بے اختیارانہ طور پر اس سے لطف اٹھانے لگتا ہے۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ذرا اس حقیقت کا تصوّر کیجیئے کہ جو شخص مطلوب کے نباہ نہ کرنے پر شکایت کے بجائے شکر ادا کرے اسکی یاس کی دُنیا کتنی وسیع ہوگی "تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی" یہ الفاظ جس دل سے نکل سکتے ہیں اور جس قلم سے صفحۂ قرطاس پر آسکتے ہیں وہ کس دُنیا میں ہوگا۔ شاعر جس خیال کو موزوں کرنا چاہتا تھا۔ اسکے اندر اُس نے کتنی کامیابی حاصل کی ہے۔ جس مایوس کے لئے بڑی بھلائی ہو سکتی ہے جس کے لئے بے وفا سے کم نہیں ثابت ہوتی اسکی حالت بعینہٖ اس شخص کی سی ہوگی۔ جو انتہائے یاس میں رو نہیں سکتا۔ اور ہنسنے پر مجبور ہے اسکے بعد شاعر دُنیا اور اہل دُنیا سے قریب تر ہو رہا ہے اور خدا جانے کیا سمجھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ " میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس سے زیادہ پُر درد طرز فراوانی جذبات کے اظہار کا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو　　کہیں دامان تر نہ ہو جائے

کہتا ہے جیسے آنسو پونچھنے سے ان کا دامن تر ہو جائے گا۔ لیکن اس شعر کو

دیکھئے جو اس شعر کے لفظ لفظ میں پوشیدہ ہے میں رو رہا ہوں وہ دیکھ رہے ہیں اتنا نہیں ہوتا۔ کہ اپنے دامن سے میرے آنسو پونچھ کر مجھے تسلی دیں۔ وہ میرے آنسو پونچھنا گناہ سمجھتے ہیں شعر کا مختصر الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ دیکھئے میرے آنسو نہ پونچھئے کہیں آپ گنہگار نہ ہو جائیں کہیں آپ کا دامان تر نہ ہو جائیں۔

ایک جگہ یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ غیر کی تپش دل صحیح نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف اسکی نمائش کرتا ہے۔ اس کو یوں ظاہر کرتا ہے۔

مانے نہ مانے منع تپشہائے دل کروں ہیں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

اسی طرح کہتا ہے ہم نے اس کوچہ میں اتنا زمانہ صرف کیا کہ شہر کی حالت بالکل بدل گئی۔

بعد مدت اس کو سے یوں ہیں تنگ آکہ جائے چلئے پھرتے ہیں پوچھتے مکان اپنا

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل ہیں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

معشوق کے نقش پا کا سجدہ فریضہ عشق ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ نقوش کوچۂ رقیب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور دیکھنے والے یہ تو سمجھیں گے نہیں کہ عاشق نقش پا کے سجدے کر رہا ہے۔ بلکہ یہ خیال کرینگے کہ رقیب سے مرعوب ہو گیا۔ اور اس کی خوشنودی کے واسطے ناصیہ فرسائی کرتا ہے۔ لہٰذا کوچۂ رقیب میں نقش پا کے سجدے باعث ذلت ہوئے۔

یہ بیکسی ہائے تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت دعائے وصل نہ کی وقت تھا انتظار کا سا

وصل سے بیکس ہو کر اپنے مرنے کی دعا مانگی جب اس طرح قبول ہوئی کہ معشوق قتل پر آمادہ ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ قرب قاتل و مقتول ہے اب وصل کوئی مشکل نہ تھا

مگر جوشِ یاس نے دعائے وصل سے باز رکھا ورنہ دعائے مرگ کی طرح وہ بھی مستجاب ہوتی

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پہ سبک ہے وہ جو تری طبع پہ گراں نہ ہوا

معشوق نے عاشق کو بزم سے اٹھا کر غیر کو ہنسی کا موقع دیا۔ عشوق سے عاشق کہتا ہے کہ تو ایسا نازک مزاج ہے کہ جو شخص تری طبع پہ گراں نہ ہو اس سے زیادہ ذلیل اور چھچھورا کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں سبک نہیں ہوں بلکہ دراصل سبک وہ ہے جو تری طبع پہ گراں نہ ہوا۔ ہم بزم ہونے کا اقتضا یہ تھا کہ غیر مجھ سے ہمدردی کرتا نہ کہ خندہ زن۔ اگر غیر خوش نہ ہو ایک دن وہ بھی یوں ہی نکالا جائے گا۔ نازک مزاج معشوق اس سے بھی ایسا ہی سلوک کرے گا۔ اور اسکی حالت مجھ سے زیادہ قابل عبرت ہو گی

کیا اس نے قتل جہاں اک نظر میں کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

اس طرح کے قتل میں مرنے والوں کی کتنی حسرتوں اور امنگوں کا خون ہوا ہو گا۔

جب مجھے رنج دلِ آزاری نہ ہو بے وفا پھر حاصل بیداد کیا

لفظ بے وفا جس خوبی سے صرف ہوا ہے اسکی داد دینا ممکن نہیں۔

نہ مانوں گا نصیحت پہ نہ سنتا میں تو کیا کرتا،

کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

معشوق کی طرف مخاطب ہے کہ تم ناراض نہ ہو میں اسکی نصیحت نہیں مانوں گا مگر بات یہ ہے کہ اگر میں اسکی باتیں نہ سنتا تو کیا کرتا کیونکہ وہ بار بار تمہارا نام لیتا تھا اور چونکہ میں تمہارے نام کا عاشق ہوں۔ اس مزے سننے پہ مجبور ہوا۔

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا ؎ غیر لے جائے ہے پیام مرا

غیر کا دل جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے پگھل گیا۔ بجائے دشمن کے میرا دوست بن گیا۔ اور میری طرف سے پیام لے چلا۔ اگرچہ میرا شوق اس درجہ پہ تھا۔ پھر بھی ناتمام تھا۔ ورنہ میں خود اپنا پیام لے جاتا یا معشوق کو خود بخود میرے حال کی خبر نہ ہو جاتی؟

سرمگیں آنکھوں سے تم نامہ لگانے کیوں ہو

خاک میں نام کو دشمن کے ملانے کیوں ہو

محبوب کو اور کس طرح رقیب کے خط کی تکریم کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

اب بجائے دوستیِ دشمن محبوب مجبور ہے۔ کہ وہ غیر کی طرف نہ دیکھے۔ محبوب پر ثابت کیا ہے۔ کہ تمہارے نہ دیکھنے سے دشمن کا فائدہ ہے اور درحقیقت فائدہ اپنا مقصود ہے

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

بزم میں اگر آپ نے سب کی طرف دیکھا اور صرف مجھ سے تجاہل برتا تو لامحالہ اغیار یہی نتیجہ نکالیں گے کہ آپ کو مجھ سے کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میری طرف بھی اک نگاہِ غلط انداز ڈال لیجیے۔

یہ عذر امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا ؎ میں الزام اُنکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

عاشق محبوب سے اسکی بے نیازی کا شکوہ سنج ہوا۔ اُدھر سے جواب ملا کہ میں اب تک تمہارے جذبۂ دل امتحان کرتا تھا۔ کہ اگر تمہارا جذبۂ دل صادق ہے تو مجھے خود کھینچ لائے گا۔

جذبۂ دل اسے کھینچ کے لائے تو کہاں لائے ؎ جو غیر کا گھر ہے وہی مسکن ہے ہمارا

محبوب غیر پسند ہو چکا ہے اور ہر وقت اغیار کی محفل میں رہتا ہے عاشق بھی اس باصرہ افروز منظر سے مستفید ہونے کے لئے وہاں پڑا رہتا ہے کبھی کبھی اگر جذبۂ خود داری اُسے مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ کیوں اغیار کے یہاں یوں ذلیل ہو رہا ہے۔ تو معاً اُسے یہ خیال بھی آتا ہے۔ کہ اگر جذبۂ دل اُسے کھینچ لائے بھی تو کہاں لائے کہ غیر کا گھر ہی اپنا مسکن بن چکا ہے۔ اگر اپنا گھر ہوتا تو شاید ہم بھی جذبۂ دل کا امتحان لیتے۔

تم بہرِ سیر نکلے تو نکلے گا مہر بھی
ہو وے گا اجتماع شبِ ماہتاب میں

شبِ ماہتاب سے لطف اندوز ہونے کے لئے محبوب سیر کو نکلتا ہے عاشق یوں گویا ہوتا ہے۔ کہ اگر تم نے قدم رنجہ فرمایا تو آفتاب بھی شوقِ ملاقات کے لئے نکلے گا۔ تاکہ تمہاری تجلی سے بہرہ مند ہو اور یہ اجتماع مہر و ماہ اپنی نوعیت میں کتنا عجیب ہوگا۔

عاید فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ
ہیں کیا کسی سے صبر تمہیں دیکھ کر نہ ہو

محبوب عاشق کو صبر کی تلقین کرتا ہے کہ تم مجھے دیکھ کر اتنے مضطرب کیوں ہو جاتے ہو کیا تم نے اپنے جذبات پر قابو نہیں پایا۔ وہ جواباً عرض کرتا ہے کہ تمہاری دلربا شوخی اور دلفریب نگاہ ایسی ہے کہ میں تو کیا کسی سے بھی صبر نہ ہو سکے

ہم تو سمجھتے نہیں تا شام وہ آئیں بھی تو کیا
اے دعائے سحری منتِ تاثیر نہ کھینچ

عاشق قریب المرگ ہے اور بےساختہ اس کے مُنہ سے دعائیں نکل رہی ہیں کہ اے خدا مجھے محبوب سے ملا دے لیکن جب عاشق کو ان دعاؤں کا احساس ہوتا ہے تو وہ دعاؤں کو منع کرتا ہے کہ خواہ مخواہ استجابت کے لئے اتنی بے قرار نہ ہوں

اس لیئے کہ اگر انہیں قبولیت کا درجہ بھی عطا کر دیا گیا جب بھی وہ شام سے پہلے آنہیں سکتے۔ اور شام تک میری روح ہوا ہو جائے گی۔ اس لئے خواہ مخواہ انہیں یہ احسان اپنے سر نہ لینا چاہیئے

حسرتیں میرے نصیبوں میں لکھی ہیں کیا کیا اتنے دفتر ہیں کہاں فصل نہیں یا نہیں

عاشق دراصل آٹھ دن کی تکلیف اور روزمرہ کے حوادث سے تنگ ہے

جس غم میں مر رہے تھے وہ غم ہی نہیں رہا افسوس مر کے دیکھا کہ جینا ہے کیا عبث

جس غم سے جاں بلب ہو کر عاشق نے موت کے دامن میں پناہ لی تھی زندگی کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد اس غم کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مرنے کے بعد عاشق پر یہ حقیقت کھلی کہ غم ہجر میں جینا کس قدر عبث اور بے کار ہے

کیا کہوں تم جو نہ آئے کیا قیامت آگئی مہماں تھا میرے گھر میں روز محشر رات کو

شب وعدہ ہے اور محبوب حسب وعدہ آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرنا چاہتا عاشق کو جس کرب و بلا کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اسے اس طرح بیان کر کے اپنے دل کو تسکین دی ہے۔

باتیں وہ تیری ہوش ربا ہیں کہ کیا کہوں جو کوئی راز داں ہے مرا راز داں نہیں

حفظِ اسرارِ عشق میں نہایت ضروری ہے مگر عاشق نے اپنا راز کسی سے کہا ہے۔ جب ہوش میں آتا ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ کیوں میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا

عشق کیوں در پے ہاں۔ شوق ہے کیوں سینہ شگاف

دشمنی دل شکنی شیوۂ احباب نہیں!

عشق اور شوق جاناں ایسے جذبے ہیں کہ جن کے بغیر عشاق کی زندگی محال ہوتی ہے۔ لیکن یہی اسکے دو محبوب ترین جذبے ایسے ہیں جو اسکی جان کھاتے رہتے ہیں عشق نے اس کا جگر کباب کر دیا ہے اور شوق کے ہاتھوں سے جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

سرفروشوں کے اگر آپ خریدار ہوئے تو گراں ہووے گی وا عشق جو کمیاب نہیں

ہر شعلہ در پر دنیا پر دانوں کی طرح جان دیتی ہے۔ اور عشاق کی بہتات کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اگر اسی جان بکف نہادہ جماعت سے ایسے لوگوں کی تلاش کیجائے جو صحیح معنوں میں سرفروش کہلائے جا سکیں تو شاید ناممکن ہے۔

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم

گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

آغاز عشق کی سرگذشت سنئے۔ وہ چھپنے لگے ہیں بلکہ چھپائے جانے لگے ہیں اگر کبھی حسن اتفاق سے ملاقات ہو گئی تو پیشتر اس کے کہ عاشق اسکی شکایت کرے کہ اب تو اپنی صورت دکھانا بھی چھوڑ دیا ہے، وہ ملتے ہی بول اٹھتے ہیں، ہم مجبور تھے تم سے مل نہ سکے۔ کیا کریں؟ اور ملامت کرتے ہیں۔ گھر گھر ہماری محبت کا چرچا رہتا ہے۔ مطلب اس کہنے سے یہ ہوتا ہے کہ ہماری وفا اور محبت میں فرق نہیں آیا ہے نزدیک کی ملامت سے جان مصیبت میں ہے ہمیں خود تم سے جلد جلد نہ ملنے کا افسوس ہے۔ اب انجام محبت کا بھی حال سن لیجئے یا ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ اتفاقیہ ملاقات ہی محض اظہار وفا کے لئے تم ملامت اقربا کا ہم سے گلہ کرتے تھے۔ یا اب وہ دن آگیا ہے کہ اب مجھے اسمیں بھی شک ہے کہ اب یہ باتیں تمہیں یاد بھی ہیں یا نہیں۔ یہ غزل پوری کی پوری

سادگی صفائی، تاثیر و حلاوت تسلسل اور لطافت میں ڈوبی ہوئی ہے اس کے پڑھنے کے بعد عہد الفت کے بھولے ہوئے افسانے کی یاد خود بخود تازہ ہو جاتی ہے اس غزل کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن کی یہ غزل دنیائے تغزل کی نہایت ہی مشہور و مقبول چیز ہے اور اسمیں کلام نہیں کہ مشکل ہی سے دو چار چیزیں کلام اساتذہ میں ایسی نظر آئیں گی۔

رقیب کی رقابت، غم عشق، وعدہ وصال، امید وفا وغیرہ سینکڑوں قسم کے واقعات ہیں جو عاشق کو عشق میں پیش آتے ہیں۔ ان واردات کو شعر میں بیان کرنا کہ سننے والے کے دل میں وہی جذبات موجزن ہونے لگیں۔ شاعری کا بہت بڑا کارنامہ ہے ورنہ رقابت، شب ہجراں کی مصیبت عشق کی جانکاہی۔ وعدۂ وصل میں انتظار وغیرہ فی نفسہٖ کوئی ایسے واقعات نہیں جو کسی کو پیش نہ آتے ہوں اس لئے ایک ہی چیز کا ذکر جو عام ہو۔ اسمیں کوئی جاذبیت نہیں پیدا ہو سکتی مگر شاعر اپنے جوشش بیان اور طرز ادا سے اسے اس قدر لطیف اور پُرکیف بنا دیتا ہے کہ اس کا لطف کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے سننے والے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں ملاحظہ ہو مومن نے بیکسی و بیچارگی کی کیسی مکمل تصویر کھینچی ہے پوری غزل درج ذیل ہے۔

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے
تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آجاتے
تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم

اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے
تو بات بات میں مضطر رہا نہ کرتے ہم

نہ جاتے اس بتِ ہرجائی کی گلی میں اگر
تو دوڑے دوڑے فلق سے پھرا نہ کرتے ہم

اس آفتِ دل و جاں پر اگر نہ مرجاتے
تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم

نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا
تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم

اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی
تو بیٹھے بیٹھے یونہی چونک اُٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پہ
تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا
تو بات بات میں یوں رو دیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ
تو ایک ایک کی صورت تکا نہ کرتے ہم

جو غم ہوں گا نہ ہوتا تیری طرح مومن
تو دیکھ چرخ کو ہے ہے خدا نہ کرتے ہم

اس پوری غزل کے اندر جو نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ کس دلدادہ و آشفتہ حال پر صادق نہ آئے گا۔ راہِ عشق میں جن جن منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے ان کا کماحقہ بیان اور کیا ہو سکتا ہے چند سادہ الفاظ میں معانی کا ایک دریا ہے جو موجیں لے رہا ہے اور شاعری کی وہ کونسی خوبی ہے جو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہے

مومن کے یہاں محبوب کا جو احترام ہے وہ اردو کی عشقیہ شاعری میں بہت کم نظر آتا ہے ان کے اشعار میں محبوب کی کہیں ایسی شکایت نہیں ملتی جو اس کے

کردار اور فطرت کو بُرا نہ بتلائے، یا اسے بری روشنی میں پیش کرے۔ انکا بنیں ہیں لیکن ان میں محبوب کی نرمی، نیکی اور انسانیت کا وہ اعتراف ہے جو ایک نہایت خوشگوار اثر ڈال لینے کے علاوہ محبوب ہی نہیں بلکہ انسانیت کی طرف ایک شریفانہ رجحان پیدا کر دیتا ہے اور ہماری تہذیب نفس میں معاون ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ جس لہجہ میں انہوں نے محبوب کو مخاطب کیا ہے۔ وہ جذبۂ محبت، احساس انسانیت اور لطیف تفکر کا ایک ایسا دلکش امتزاج پیش کرتا ہے جو دوسروں کے یہاں بالکل مفقود ہے۔ انکا پورا دیوان مطالعہ کرنے کے بعد یہی پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ دوسرے شاعروں کی طرح امرد پرستی کا ذکر نہیں کرتے بلکہ عشق پر وہ نشیں کا دم بھرتے ہیں، اور کھلم کھلا کسی عذرا، سلمیٰ یا لیلےٰ کو معشوق نہیں بنایا ہے۔

ہجر پر دہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

اگرچہ اردو شعرا نے فارسی کی تقلید میں بہت زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ اور اردو کے بعض بلند مرتبت شعرا بھی اس عیب سے نہ بچ سکے۔ اور ان کا دامن داغدار ہو کر رہا۔ چنانچہ میر صاحب کہتے ہیں:

خط منہ پہ آئے جاناں خوبی سے جان دے گا
ناچار عاشقوں کو رخصت کے پان دے گا

مومن کے ہمعصر ذوق بھی اس رنگ میں کہتے ہیں۔

ذوق ہے ایک رند شاہد باز دخل کیا اس کو پارسائی میں

غالب جیسا شخص بھی اس عیب سے نہ بچ سکا۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریف دمِ افعی نہ ہوا

دوسرے دور میں مصحفی کو دیکھئے۔

مان کہنے کو مرے امرد پرستوں سے نہ مل — صاف چہرے پہ ترے خط کا ابھی آغاز ہے

تیسرے دور میں آتش بھی اسمیں مبتلا نظر آتے ہیں۔

سبزہ سے خط یار کے ہوتا ہے غم غلط — کیونکر کہیں نوشتۂ قسمت کو ہم غلط

گوکہ مومن کے یہاں بھی اس قسم کے بعض اشعار پائے جاتے ہیں جیسے

دلِ مومن آتش کدہ کیوں بنے — لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے

لیکن اس کا یہ شعر الشاذ کالمعدوم کے حکم میں شمار ہوگا اور اس کا یہ عام رنگ نہیں کہا جاسکتا۔ مومن نے جہاں کہیں معشوق کا ذکر کیا ہے۔ تو لفظ "پردہ نشین" کے ساتھ بعض اشعار ملاحظہ ہوں

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں — میں نے دعوی کیا تحمل کا

جوں نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر

دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا
اس بتِ پردہ نشین نے جلوہ گر دکھلا دیا

دشمنی دیکھو کہ تا الفت نہ آجائے کہیں — لے لیا آئینہ پردہ پہ حال میرا دیکھ کر

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں — ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں — تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

بسکہ اک پردہ نشین سے دل بیمار لگا — جو طبیبوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا

بعض لوگوں کے نزدیک لفظ "پردہ نشین" ماہ پارہ۔ غیرت ناہید۔ رشک آفتاب آفتاب حسن کے مقابلہ میں غیر فصیح ہے۔ اسلئے اس کا استعمال ان الفاظ کے مقابل میں محبوب کے لئے جائز نہیں حالانکہ یہ لفظ مذکورہ بالا الفاظ سے کہیں زیادہ معنویت رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آج کل کا مذاقِ حسن بے پردہ حسین بے پردہ کو ترجیح دے۔ لیکن مومن کے عہد میں حسن بے پردہ کو ترجیح حاصل تھی۔ اور یوں بھی یہ لفظ کسی طرح غیر فصیح نہیں کہا جا سکتا۔

نفسیات مومن کی وہ خصوصیت جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ نفسیات کے دشوار ترین مسائل کو سادہ الفاظ میں دلکش طریقہ سے بیان کرنا ہے اور ایسی معنوی تناکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجربہ کرنے کے بعد ہی ان کا پتہ چل سکتا ہے۔ وہ محبوب کو فکر جور سے باز رکھنا چاہتا ہے تو کہتا ہے۔

دن رات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک

میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

وہ محبوب سے کہتا ہے کہ مجھ کو ستانے کی فکر میں دن رات الجھے رہنا بیکار پریشان ہوتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے اس خیال کو ترک کر کے سکون حاصل کرو۔ "میں بھی ذرا آرام لوں" کا ٹکڑا محض گمان رفع کرنے کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جزو نے اس مدعا کے ماننے کا نفسیاتی اثر بڑھا دیا ہے کیونکہ فطرت انسانی ہے کہ جب کسی کے فائدہ کی بات بتائی جاتی ہے تو وہ غور کرتا ہے کہ کیوں ایسا مشورہ دیا گیا اور اس کو کیا غرض تھی کہ وہ میرے فائدے کی بات بتاتا۔ اسلئے گمان بد کی بنا پر بعض مرتبہ وہ مشورہ قبول نہیں کیا جاتا لیکن اگر ساتھ ہی مشورہ دینے والا یہ بھی کہدے کہ اس میں تھوڑا

سا فائدہ مبیرا بھی ہے تو پھر غور و تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس کو بالکل موافقِ فطرت مان لیا جاتا ہے۔

خامشی مرگ ہوا نشانہ سناتا ورنہ ۔۔۔ دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

محبوب سے کہنے اور استدعا کرنے کا کتنا انوکھا انداز اختیار کیا ہے۔ دبی زبان سے شکوہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور کہیں کہیں اس داستان کے پردے میں عرضِ وفا کے افسانے بھی سنائے جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ تقاضائے کرم بھی کرتے جاتے ہیں سب کچھ کہتے جاتے ہیں۔ مگر فائدہ اُسی دشمنِ جاں بدِ نظر ہے۔

شعلۂ دل کو ناز نالش ہے ۔۔۔ اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور آتشِ ہجر نے دل و جگر کو پھونک رکھا ہے۔ عاشق محبوب کے مزاج سے واقف ہے اسے معلوم ہے کہ محبوب کو دعویٰ یکتائی ہے۔ مگر دیکھئے ملاقات کی کیا پیاری صورت نکالی ہے کہتا ہے۔ شعلۂ دل کو ناز نالش پر ناز ہو چلا ہے خدارا آؤ! اور اپنا جلوہ ذرا دکھا جاؤ۔ مقصد یہ ہے کہ جو آگ تم نے لگائی تھی وہی آج بلند ہو کر تمہاری تجلی پر چشمک زنی کر رہی ہے۔ تمہارے ہجر میں بھی وہ اثر ہے۔ کہ وہ شعلۂ دل میں اتنی تابانی پیدا کر سکتا ہے۔

محفل میں تم اغیار کو دز دیدہ نظر سے ۔۔۔ منظور ہے پنہاں۔ رہے راز تو دیکھو

محبوب جب کبھی دزدیدہ نظر سے دیکھتا ہے تو عاشق کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر یہ تکلیف دور کیونکر ہو عاشق کو یہ تدبیر سوجھی کہتا ہے آپ اگر رازِ عشق کو ظاہر ہی کرنا چاہتے ہیں۔ تو محفل اغیار کو دزدیدہ نظر سے دیکھئے اور ضرور دیکھئے۔

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم ۔۔۔ ایک عالم ہو رہا ہے کیوں اے گردشِ ایام ہم

کیوں اے گردشِ ایام کیا اسی کا نام گردش ہے کہ ہم اب تک اسی عالم اضطراب میں ہیں۔

لذتِ جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا طعنے کیا کیا اسے ارباب ستم دیتے ہیں

یعنی اب مجھ پر ستم کرنے کی صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔ کہ وہ ترک ستم کرے

گر نہ کر وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے گو قتل کا وعدہ ہے تقاضہ نہ کریں گے

تقاضا نہ کرنے کے لئے صرف وعدۂ قتل کو تجویز کیا ہے اپنا مطلب ہر حال میں حاصل ہے

مومن نے بعض جگہ شعور و وجدان سے بھی کام لیا ہے اور دنیائے شعر و نفسیات میں ان دونوں چیزوں کو جو اہمیت حاصل ہے ظاہر ہے۔ کہتا ہے ؎

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

قفس میں دل کا بہل جانا آشیاں کے برباد ہونے کی علامت ہے ممکن ہے یہ نفسیاتی حقیقت بھی جس کے معلوم ہونے کا واحد ذریعہ گذشتہ تجربات کی صحت پر مبنی ہے۔ اگر تجربہ غلط ہے اور اسکی غلطی معلوم نہ ہوئی تو اس سے نتیجہ نکالا جائے گا۔ غلط ہوگا حقیقت میں اس دنیا میں صرف شعور ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

ہو نہ بیتاب ادا تمہاری آج کچھ تو کہتی ہے بیقراری آج

یعنی یہاں صرف میرا بے قرار دل محسوس کر رہا ہے کہ تمہاری ادا بیتاب ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ فلاں نظریہ علمی اسکے خلاف ہے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا حقیقت تو یہ ہے کہ ہر قسم کے نظریہ علمی کی تائید و تردید سے بے نیاز ہے۔

طنزیات ادبیات میں طنز کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ

شاعر کی داخلی زندگی اور اسکے ذہنی وجذباتی ارتقاء کا بھی اسی سے پتہ چلتا ہے
اردو کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی طنز کافی ترقی یافتہ شکلوں میں پایا جاتا ہے۔
انگریزی ادبیات میں اسٹیل اور سوئفٹ اپنی طنزیہ تحریر کی بدولت مشہور ہیں۔
طنز کا استعمال اظہار خیال کے لئے خطرات سے خالی نہیں۔ طنز نگاری کے لئے
چند باتیں ضروری ہیں اور دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ طنز کے استعمال کرنے والے کی ذہانت کا
کیا درجہ ہے اور اسکے مزاج میں شائستگی بھی ہے یا نہیں سب سے بڑا عیب جس سے ہر طنز
نگار کو بچنا پڑتا ہے۔ وہ سطحیت ہے۔ اوچھا وار عموماً کرنے والے ہی پر پڑتا ہے اس لئے
طنز نگار کے لئے نہ صرف ذہنی قوت لازمی ہے بلکہ ذہنی لطافت بھی۔ اس سلسلہ میں
یہ بھی قابل غور ہے کہ طنز کا ہدف کون پایا گیا ہے۔ طنز کی اہمیت کا صحیح اندازہ بھی اسی
بات پر منحصر ہے اور طنز نگار کی ذہنی بلندی کا بھی اسمیں امتحان ہوتا ہے۔ کہ وہ کس شے
پر کس عنوان اور انداز سے روشنی ڈالتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ طنز کی بصیرت افروز قدریں بھی
منکشف ہوتی ہیں جو انسان کی تمام ذہنی کوششوں کا حاصل اور اُن کی قدر و قیمت
کا معیار مقرر کرنے والی ہے۔ ایک ہجو گو طنز گو ہو ہی نہیں سکتا۔ حقیقت میں طنز نہایت
بلند چیز ہے۔ ہاجی کی پرواز تخیل وہاں تک پہنچ نہیں سکتی۔ نثر میں طنزیہ پیرایۂ بیان
اختیار کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا نظم میں۔ نثر کی تحریروں میں کبھی کبھی بعض مصنفین
کے یہاں طنزیہ رنگ ضرور جھلکتا ہے لیکن نظم میں بہت کم شاعر اتنا لطیف مذاق فطرت
کی طرف سے لے کر آئے۔ جو طنزیہ شاعری کر سکے جہاں تک تاثیر کا تعلق ہے۔ میرا
خیال ہے۔ کہ طنز وہ نشتر ہے۔ جو رگ جاں پر کارگر ہوتا ہے۔ طنز میں نزاکت ہے
اور ہجو میں سخافت۔

مومن کی خصوصیات میں طنزیہ شاعری بھی ہے۔ یہ بات کسی شاعر کو کم نصیب ہوتی ہے۔ مومن کی لطافت مذاق کا یہ عالم ہے کہ وہ طنز گو ہیں لیکن ہجو گو نہیں۔ مومن نے دنیائے عشق و محبت میں جو مصیبتیں جھیلی ہیں جن کا نقشہ اُن کی آپ بیتی مثنویوں میں نظر آتا ہے ہمیں مجبور کرتا ہے۔ کہ ان کے طنزیہ کلام کو محض طعن و تشنیع کہہ کر ٹال دیں۔ بلکہ اس تلخ حقیقت پر غور کرنے پر مجبور رہوں ۔۔ جو ان کے طنزیہ اشعار کے لفظ لفظ میں ساری ہے۔

مومن کی طنزیات کے مطالعہ کے بعد اُس کی شخصیت اور مزاج جو تصویر ذہن کے سامنے آتی ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کی ہے۔ جو غیر معمولی حساس اور تنک مزاج ہو۔ اور جس کو خدا نے ایسا بیدار پر نعمد تخیل دیا ہو جو حقیقتوں کو ذہنی طور پر اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال سکے۔ اس کا نتیجہ ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جہاں حقیقتوں سے اس کی ٹکر ہوئی اس کے ہوائی قلعے مسمار ہو گئے۔ اور وہ اس ردِ عمل سے جھنجھلا اٹھا اور اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے تمام چیزوں پر طنز کرنے لگا۔ غیر معمولی حساسیت کا نتیجہ یہ ہو کہ جہاں کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی طبیعت پریشان ہونے لگی اور چونکہ تخیل نے توقعات کو بلند کر دیا تھا اس لئے جب نا امیدی ہوتی تھی تو اضطراب کی شدت بڑھ جاتی تھی۔ بے صبری کے عالم میں یوں صبر و ضبط کرنا اذیت کا انتہائی تجربہ ہے۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر   لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

اس شعر میں مومن نے طنز کا کمال دکھا دیا ہے۔ ہاں اے چارہ گر اگر تو جوشِ وحشت کا علاج کرتا ہے تو پہلے یہ بتا کہ تو بازار سے جنگل بھی لا سکتا ہے یا نہیں۔ مومن

کا خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ جو لوگ وحشت کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ گویا بازار سے جنگل خریدنا چاہتے ہیں جوش وحشت کا علاج تو یونہی ناممکن ہے۔ کہ وحشیوں کے لئے جنگل مہیا کیا جائے۔

آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے
یا وفا حسن و بیوفا ہے عشق

سچ ہے میں نباہ نہ کرسکا۔ عشق ہی بے وفا ہے اس ناکامیابی کا احساس کس کامیابی سے کم ہے۔ جو اس تاویل کی ضرورت محسوس ہو کہ شعر طنزیہ ہے اور سیدھے سادے الفاظ میں اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ کیا نباہیں گے۔ حسن کیا باوفا ہوگا۔ اقرار ناکامیابی کافی ہے۔ کہ بے وفا عشق کو باوفا حسن پر ترجیح دلا دے۔

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

یہ محبوب کے الفاظ تھے۔ مومن نے صرف انہیں دہرایا اور صرف ایک "سچ ہے" کا اضافہ کیا ہے۔ محبوب کی شکایت کو مومن نے پلٹ کر طنز بنا دیا۔ سچ ہے میں نے ہی تم سے بے وفائی کی۔ میں ہی خطاوار ہوں۔

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

سخت جانی کو طعنہ دیتا ہے کہ تیری بدولت روز مجھ پر خنجر ٹوٹ رہے ہیں لیکن کس انداز سے کہ اگر خنجر نہ رہا۔ تو کوئی گلے لگانے کے قابل بھی تو نہ ملے گا۔ یہ ایک لطیف طنزیہ انداز ہے جو مومن پر ختم ہے۔

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کیلئے

خواب چشم پاسباں کا اپنے بخت خفتہ کو سبب قرار دینا ایک عجیب و غریب مضمون ہے۔ اس پر اسکے انداز بیان کی شوخی نے ایک اور قیامت ڈھا دی

ہے

ہنسو نہ تم تو مرے حال پر میں ہوں وہ ذلیل
کہ میری ذلت و خواری سے تم کو شان لگی

دنیا مجھ پر ہنستی ہے ہنسے لیکن تمہیں میری ذلت پر ہنسنے کا کوئی حق نہیں میری ذلت و خواری نے تمہاری شان بڑھائی۔ اس شخص کی زندگی پر ذرا غور کیجیے جو یہ کہنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسے ہی حالات انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ طنز مجسم ہو جائے

بندے ہیں ہم صیاد کے کہنا ہے کس کس لطف سے
گر ہو سکے راہ چمن اے رستگان دام لو

جب صیاد کو معلوم ہو چکا کہ ہم گرفتار صیاد ہیں تو کتنا لطف لے لے کر کہتا ہے گر ہو سکے راہِ چمن اے رستگان دام لو، صیاد نے کتنا طنزیہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے لیکن گرفتار کو مجبوراً یہ زہر کا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
کیوں الجھتے ہو جنبشِ لب سے خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب

مطلع کا طنزیہ انداز ملاحظہ ہو۔ ایک تو اس کے معنی ہوئے کہ بے وفا کہہ کر اپنی وفا شعاری پر زور دیا جا رہا ہے لیکن اگر اسی کو سچ سمجھ لیجیے کہ "ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب"۔ اور اس مصرعہ کی کوئی تاویل نہ کیجیے پھر اس کے بعد مومن کی ذہنیت کا تجزیہ کیجیے اس وقت آپ پر روشن ہو گا کہ اس شعر میں کتنے تیر و نشتر پوشیدہ ہیں جو شخص یہ کہہ سکے "ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب" "غیر اور تم بھلے بھلا صاحب" وہ کیسی دنیا کا رہنے والا ہو گا۔

دوسرے شعر میں زبان کو لیجئے کتنا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے اگر آپ نے کسی کو جنبشِ لب سے الجھتے دیکھا ہوگا۔ تو یقیناً اس شعر سے محظوظ ہوں گے

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

"سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا" بظاہر اس کہنے سے وہ یہ مفہوم لے رہا ہے۔ کہ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ تو عدو سے بے سبب خفا ہوا لیکن طنز کا صرف سطحی پہلو ہے۔ اب ذرا غور کیجئے اگر شاعر جو کہہ رہا ہے اس کو محسوس بھی کر رہا ہے اور اس سے وہی مطلب لیتا ہے جو کہہ رہا ہے نہ کہ اس کا برعکس تو اس کے کلام کے طنز کا کیا ٹھکانا۔

طنزیہ کلام کے سمجھنے میں عام طور پر متکلم کے بارے میں ہمارا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے صحیح نہیں ہے یعنی الفاظ کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اور مدعا کچھ اور۔ حقیقت میں مومن نے طنز کے انداز کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اور اس کا طنز حقیقت کے پہلو بہ پہلو ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں جس کے اندر شاعر نے انتہائی معنویت اور طنز سے کام لیا ہے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

رحم فلک اور میرے حال پہ رحم — تو نے کرم اے ستم آرا کیا

کیا پسند آئی اپنی جور کشی — چرخ کے انتخاب نے مارا

جمع اضداد

فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے دو ضدیں بیک وقت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ سفیدی نام ہے سیاہی کے عدم کا۔ اس لئے ایک چیز یا تو سفید ہو گی۔ یا پھر سیاہ۔ وہ بیک وقت سیاہ اور سفید نہیں ہو سکتی۔ کون اور فساد۔ عدم اور وجود ایک تصویر کے دو رُخ ہیں جو لازم و ملزوم کہے جا سکتے ہیں لیکن متحد نہیں ہو سکتے۔ اب یہ شاعر کا کمال احساس ہے کہ وہ عالم وجود میں عدم کی جھلک دیکھ پائے۔ یا کون و مکان میں فساد کا اشارہ پاتے اور ان اضداد و اختلافات کو اس حسن و خوبی کے ساتھ ترتیب دے کہ ان کا اتحاد مشکل نہ ہو۔

اگر دوربین نظروں سے کائنات کی تخلیق پر غور کیا جائے۔ تو اتصال و اضداد کے سوا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں نظر آئے گا۔ تمام کائنات میں قدرت کا یہی اصول کار فرما ہے۔ خلقنا کل شئی زوجین۔ جنہوں نے مخلوقات کے اس پہلو پر غور کیا ہے۔ انہیں تمام عالم اجتماع ضدین کا مظہر نظر آتا ہے۔ ایک حقیقی شاعر خلقت کے اس پہلو کو کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے۔ مومن کی شاعرانہ طبیعت نے اس حقیقت کو پا لیا۔ اور اس کا مختلف طریقوں سے مختلف صورتوں میں اپنے اشعار کے اندر اظہار کیا ہے۔

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہو گا مرگ کی آس پہ جیتا شبِ ہجراں ہو گا

یعنی ناامیدی کا علاج امید ہی سے ہو سکتا ہے۔ بظاہر اس مرض کا علاج علاج بالضد معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے یہ حقیقت خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس مرض کا علاج علاج بالمثل ہے۔ حرماں کیا ہے ناکامیاب امیدیں۔ اس کا علاج کیا ہے وہی امید۔ امید ہی مرض حرماں کا باعث ہوئی امید ہی نے اس کا علاج ہو

سکتا ہے۔

ہوئے نہ عشق میں جب تک وہ مہربان نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

عشق کے بغیر زندگی کا لطف نہیں اور عشق کے بعد زندگی ممکن نہیں۔ اس حقیقت کا اظہار اس سے بہتر لفظوں میں ممکن نہیں کہ بلائے جاں ہے۔ وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا۔

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ زیر نقاب ہستی کو بے نقاب دیکھنا چاہتی ہے نگاہ شوق کو نقاب کا حجاب ہونے کے بجائے تازیانہ ہو جاتا ہے مومن اسی واسطے پردے کو پردہ در سمجھتا ہے۔

جوں نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھکر

نقاب مانع دید تھی جب تک چہرے پر نقاب رہی دیدار نہ ہو سکا۔ انوار جمال کی کثرت نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔

اے آہ آسماں میں عبث رخنہ گر نہ ہو
ڈر ہے کہیں نزول بلا بیشتر نہ ہو

وہی آہ جو کبھی آسماں سے اثر لاتی تھی اسے بڑھتے بڑھتے آسماں میں رخنہ گر ہونے لگی جو علاج تھا وہی اب مرض ثابت ہو رہا ہے۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

یعنی اسکے نہ دیکھنے کا شکریہ ادا کیا جائے یا شکایت۔ سچ پوچھیے تو اس کی اسی ادا نے میری دنیائے دل کو تہ و بالا کر دیا ہے۔

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پہ — سبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

مومن نے اپنی رسوائی میں بھی غیر کی سبکی کا پہلو نکال ہی لیا۔ وہ محفل سے نکالے گئے اس سے بڑی سبکی اور کیا ہو سکتی ہے۔ غیر نے کتنی ہی خیال کیا اور مومن کے رسوائی کئے جانے پر خندہ زن ہوا لیکن زخم رسوائی پر اغیار کی نمک پاشی دیکھی نہ گئی اور بول اٹھے کہ میرے نکالے جانے پر غیر خندہ زن کیوں ہے؟ میں اس وجہ سے اٹھایا گیا کہ تیری طبع نازک پر بار ہوا۔ وہ سبک ہوں گے جبھی تو تیری طبیعت پر بار نہیں گذرتے۔ یہاں لفظ سبک سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے جس کے ایک معنی تو ذلیل ہونے کے ہیں اور دوسرے گراں کی ضد

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

مومن نے زمین کی گردش سے فائدہ اٹھایا (حالانکہ مومن کے قبل اور معاصر اردو شعراء اردو شاید گردش ارضی سے واقف بھی نہ رہے ہونگے۔ اور کہہ دیا کہ کہنے کو تو میں زنداں میں ہوں لیکن درحقیقت آزاد ہوں۔

قنوطیت — قنوطیت شعور انسانی کے اس انداز کا نام ہے جب حیاتِ انسانی کی حقیقی خوشی حقیقی قدر و قیمت حسن و دلکشائی یا کوئی تسلی و تشفی بخش عنصر نہ پانے سے قطعی طور پر مایوس ہو جاتے! انسانی شعور کے اس انداز نے دنیا بھر کے لٹریچر پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ "آرٹ اور فنون لطیفہ انسان کی اس خلقی یا بنیادی امنگ کا نتیجہ ہے۔ جو غم روزگار کا غم غلط کرنے کیلئے قدرت کی جانب سے اسکی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ آئندہ چل کر یہی جذبہ اندوہ عشق کے اظہار کا پر تکلف وسیلہ بن گیا۔ شوپنہار کا خیال ہے کہ "شاعرانہ محویت"

جو تمام فنونِ لطیفہ میں یکساں ضروری ہے ہم کو دنیا کے افکار و آلام سے نجات دلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غم شاعری کے لئے خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے۔ اس لئے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو محرک کرتی ہے اور غم بلند ترین جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ کامیڈی کے مقابلے میں ٹریجڈی کی فضیلت کا راز یہی ہے۔ سنسکرت کا ایک فطرت شناس نقاد کہتا ہے "کہ غم تمام تاثرات کا بادشاہ ہے"۔ انگریزی کا مشہور شاعر شیلے کہتا ہے۔ "یہ ایک تعجب انگیز حقیقت ہے کہ ہم غم سے بچنا چاہتے ہیں وہ انسان غم کو بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں"۔ دوسری جگہ پھر یہی شاعر کہتا ہے۔ کہ "ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غمناک خیال کی ترجمانی کرتے ہیں"۔ غور سے نظر ڈالئے تو غم ہی خوانِ زندگی کا نمک بلکہ حاصلِ زندگی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ایرانی شاعر کہتا ہے۔

گلشن ایجاد را شبنم غم است

حاصل در طینت آدم غم است

واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی غم کا ایک دفترِ بے پایاں ہے۔ اور زندگی کا جتنا تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ اتنی ہی یہ حقیقت کھلتی جاتی ہے کہ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

چنانچہ مومن بھی اسی خیال کا یوں اظہار کرتا ہے۔

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

یعنی ناصح تو نے یہ سمجھا ہے کہ اگر میں بے غم سے آزاد ہو جاؤں تو زندگی بآرام گذرے، حالانکہ تیرا یہ خیال غلط ہے کیونکہ یہ غم ہی دراصل قیمت حیات ہے۔ اسکے بغیر کسی قسم کی زندگی ہو ہی نہیں سکتی۔

شاعری اس میں شک نہیں کہ اپنے اندر آب حیات کا خزانہ رکھتی ہے اور جس سے زندگی و زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں اور جس سے سیراب ہو کر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین لہلہا اٹھتی ہے کسی قسم کی شاعری کیوں نہ ہو ہمیں زندگی کی تلخ ناکامیوں کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ بلکہ رزم حیات میں ہماری کامیابیوں کے لئے معین و مددگار ثابت ہوتی ہے بقول اصغر گونڈوی

آلام روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

یہی وجہ ہے کہ میر کی شاعری اور ہارڈی کے افسانوں میں باوجود ان کے درد انگیز مضامین کے ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ اور شوپنہار دیکارٹ ان کو جب ہم پڑھتے ہیں دل میں ایک طرح پر درد کیفیت محسوس کرنے لگتے ہیں اور وقتی طور پر تمام تلخ ناکامیوں کو یک لخت بھول جاتے ہیں چنانچہ اسی بنا پر شوپنہار کا خیال ہے کہ اگر آج دنیا میں حسن و عشق، فنون لطیفہ اور مذہب کا وجود نہ ہوتا تو ہمارے پاس کوئی ایسا مداوا نہ تھا جس سے زندگی کی المناکیاں اور زمانہ کی تلخیاں گھٹائی جا سکیں" چنانچہ دنیا کے مشہور و معروف شاعروں شیلے کیٹس، ورڈز ورتھ، لکسی داس، میر، غالب، نظیری اور حافظ کے کلام میں جو ہمیں لذت و سرور حاصل ہوتا ہے اس سے ہم کچھ دیر کے لئے سکون کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں حقیقت میں ان لوگوں کے کلام میں صعوبات و آلام نے زندگی کو حقیقت کے روپ میں نمایاں کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ انہیں

حقیقی شعریت وہیں مل سکتی ہے۔ جہاں مسرت اور خوشی نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی ہو۔ چنانچہ یہی بات ہے کہ اردو کے اُن اہل جنہوں نے زندگی کی وہ چوٹ محسوس نہیں کی۔ جو انسان کو انسان بناتی ہے ان کے کلام بازار میں کوڑیوں کے مول بھی نہیں پوچھے جاتے اسکے برعکس میر، درد، غالب، مومن نے اسی لیئے انسانی دلوں میں جگہ پائی ہے۔ کہ وہ اپنے اندر درد و اثر کا طوفان رکھتے ہیں اور آج بھی اس وجہ سے ایک عالم ان کے کلام پر سر دھنتا ہے۔ اور اُن کی تلخیوں میں زندگی کی لذتیں محسوس کرتا ہے۔

مومن کی زندگی سچ پوچھیے تو زندگی کی ناہمواریوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ اس کے آئینۂ خیال میں وہی جلوے زیادہ روشن اور تابناک ہیں جو براہِ راست اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جس نے اُسے غم کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کا ایک ایک شعر زندگی کی حقیقتوں کی تفسیر بن گیا ہے اور دل کے سچے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اس کے نغموں کے سننے کے بعد دلوں میں اک کیفیت سیمابی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ ۱۱

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو کہ شبِ غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے

اسی لیئے گوئٹے نے کہا ہے "جس نے کبھی غم میں لدو روٹی نہیں کھائی ہے جس نے انتظارِ سحر میں پچھلے پہر کی گھڑیاں درد و کرب کے ساتھ نہیں گذاری ہیں اے آسمانی قوتو وہ تم سے کیونکر واقف ہو سکتا ہے"۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا،

یعنی جب درد رگ وپے میں ساری ہو گیا۔ تو اب درماں موجب ہلاکت ہے۔

لذت مرگ سے ہجراں میں دعا ہے کہ خدا

یہ مزا ہو نہ نصیبوں میں کبھی بے حس کے

کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عدو کو نہ کبھی ہجر کی مصیبت اُٹھانا پڑے گی نہ اسکے صدموں سے کبھی مرنا ہوگا۔ یہ شرف تو صرف عاشق صادق کی قسمت میں لکھا ہے۔ جب یہی ہونا ہے۔ تو کیوں نہ مرگ کو شربت بنا کر اس طرح پیو کہ ایک بار تو رقیب کو بھی رشک آجائے۔

امیدِ مرگ پہ ہر فتنہ راحت جاں ہے — شب فراق میں کیا بیم روز گار مجھے

خوفِ مرگ کی بجائے امیدِ مرگ پہ زندگی بسر کرنے والوں کے لئے اگر ہر فتنہ راحتِ جاں نہ ہوگا۔ تو کیا ہوگا۔

کیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی — کیوں شور نالہائے غزا بار کم ہوا

عاشق کے نالہائے غم نے ایک شور برپا کر دیا تھا۔ مگر کہاں تک آخر طاقت جواب دے گئی اب اپنے سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے کہ نالہ وزاری کی نہ سہی۔ کیا مجھ میں سانس لینے کی بھی طاقت نہیں رہی ورنہ ہر نفس نالہائے غزا بار کا کام کیوں نہیں دیتا۔ نالہائے غزبار کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نالے نہ صرف غمگین دل سے نکلے ہیں بلکہ جو انہیں سن لیتا ہے مصروف شیون ہو جاتا ہے۔

بختِ بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں — تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

شاعر نے بختِ بد کی ایذا رسانیوں کے لئے یہ ڈرایا کہکر جو لطیف اشارہ کیا ہے اسکی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

گر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا　　حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

کہنا ہے اگر میرے نالوں کا یہی خاموش کُن اثر رہا جس کے دور ہونے کی کوئی توقع نہیں تو حشر میں بھی کوئی میرا پرسانِ حال نہ ہوگا۔ جس شخص کی ساری عمر نالہ و فریاد میں گزری ہو اور جس کا دنیا میں کوئی بھی پُرسان حال نہ ہؤا ہو وہ اگر یہ نہ سوچے کہ کل بھی حشر میں یہی ہونا ہے تو کیا کرے۔

کہ دیا حسرتِ بیداد نے احوال تباہ　　تُو تو ظالم نہیں زنہار پہ میں ہوں مظلوم

یعنی کیوں کر کہوں کہ تو ظالم ہے، خدا جانے تو ظالم ہے یا رحمدل، بہر حال میں تو مظلوم ہوں۔ یہ حقیقت ہے اور نا قابل انکار حقیقت کہ میں ہی اپنی بربادی کا باعث ہوں اور بلاشبہ تو ظالم نہیں تجھ پر الزام نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ مجھ پر ظلم ہؤا ہے۔

شاعر کا یہ بیان جس سے انتہائی بے بسی برس رہی ہے۔ اتنی ہی زور کے ساتھ کسی کے ظالم ہونے کی حقیقت کو سامع کے دل پر نقش کرا دیتا ہے جس قدر وہ اپنی مظلومی پہ زور دیتا ہے۔ اور کسی کا ظلم بغیر کہے بلکہ انکار کے باوجود بھی آشکارا ہو جاتا ہے۔

عنایت کر مجھے آشوب گاہِ حشرِ غم اک دل
کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا

شاعر نے یہاں ایسے دل کی تمنا کی ہے۔ جو صرف تمام عالم کے رنج و غم کا مجموعہ ہو بلکہ اس ہنگامہ زار میں بھی ایک شورش برپا کر دے تاکہ میرا ہر نفس شورِ قیامت کا ہمنوا ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلِ درد مند و غم آشنا کی اس سے بہتر کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

کہ دیا حسرتِ بیداد نے احوال تباہ　　دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا۔

ہمیں اتنا نہ ستا کہ جان سے عاجز آ کر مرنے کی آرزو کریں۔ ایسی صورت میں تیرے ارمان کے سوا دلِ میں خواہشِ مرگ کو بھی جگہ ملے گی اور اس میں تیری منفعتِ حسن ہے کیونکہ دلِ عاشق میں تیرے ارماں کے سوا اور کسی خواہش کا امکان بھی نہ ہونا چاہیئے۔

پا نہ سکے تھے چین کب غم دوری سے گھر میں ہم
راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم

مومن کا خیال ہے کہ گھر میں بھی دوری تھی اور اسی غم میں مبتلا تھے۔ اب غربت میں ہیں تو غربت ہم کو کیا وطن کی یاد دلائے گی وہاں کونسی راحت تھی اور یہاں کیا نہیں ہے۔

اتنے سبک نظر میں ہیں از ضلع روزگار   دُنیا کی حسرتیں مرے دل پہ گراں نہیں

یعنی زمانے کو اتنا ہیچ و پوچ سمجھتا ہوں کہ دُنیا کی حسرتیں اب میرے دل پر کوئی گرانی پیدا نہیں کر سکتیں۔

حقیقت میں مومن کا غم ایسا نہیں ہے جس طرح عام قنوطیوں کا ہے۔ بلکہ وہ اپنی موجودہ زندگی پہ قانع نظر آئے گا بخلاف شوپنہار اس کے خیال میں اس دُنیا کے ہنگاموں میں ایک اندھی مشیت کارفرما نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ کائنات اور زندگی سے بیزار نظر آتا ہے۔ لیکن مومن اس سے گھبراتا نہیں۔ بلکہ بیں کھٹک اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

اہل بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے   عشرتِ عمر ابد قیمتِ غم دیتے ہیں

حقیقت میں وہ ہمیں اپنے حزن و ملال میں بھی زندگی کی قدروں کو پہچاننے کی دعوت دیتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار شعر ایسے بھی کہے ہیں جو اسکے

دکھی دل کے صحیح معنوں میں آئینہ دار ہیں مثلاً وہ کہتا ہے۔

کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ کھائے داغ
زخموں پہ زخم جھیلے ہیں داغوں پہ کھائے داغ

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

صبح فرقت ہے وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

بھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موئے پہ خلل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

اس کوچہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رکھی دل نے
نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا

شب رہے تجھ بن نہ بس بے چین و بے آرام ہم
صبح تک رو رو کئے لے لے کے تیرا نام ہم
دیوار کے گر پڑتے ہی اٹھنے لگے طوفاں
اب بیٹھ کے کوئے میں بھی رو دیا نہ کہیں گے

سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی
تو جان کا عذاب ہوا دل کا تھامنا

رو رو کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے
اب تو خوش ہو بے وفا تیرا ہی لے کہنا کیا
چارہ گر کعبے میں اس کے آستاں سے لے گئے
ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا
کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کریں
دھر دیا تھا ہاتھ اس نے دل پہ دل دھڑکا کیا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں، سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
نہ پوچھو کچھ مرا احوال میری جان مجھ سے یہ دیکھ لو کہ مجھے طاقتِ بیان نہیں

کہاں ہے تاب ناز برق اے کاش
جلا دے آتشِ گل آشیاں کو

سامنے سے جب وہ شوخِ دلربا آ جائے ہے
تھامتا ہوں پہ یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے
حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

بقول نیاز فتحپوری: "کہ اگر ان کی محبت ذرا اور بلند ہو جاتی تو پھر آج یہ جستجو نہ ہوتی کہ اُردو شاعری میں دوسرا میرؔ کون ہو سکتا ہے" دراصل مومنؔ کی قنوطیت دوسرے مشہور قنوطیوں کے برعکس ہے نہ وہ شوپنہار کی طرح جمالیات کے ذریعے اپنی قنوطیت کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور نہ میرؔ کی طرح فریب تخیل میں گم ہیں اور نہ ورڈز ورتھ کی طرح سیلاب جذبات میں سرشار۔ بلکہ جو کچھ کہتے ہیں کافی سوچ کر کہتے ہیں اور ان کی شاعری کانٹ، کینن، رشڈال، اور سیگوک کے "اصول قوت اخلاقی" کی پابند معلوم ہوتی ہے،

وہ کانٹ کی طرح احساس فرض کے قائل تھے —— اور اُن کا کلام گویا اسی فریضۂ شاعری کی پیداوار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے الگ ہو کر بھی انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اس وقت وہ مومنؔ نہیں رہے بلکہ میرؔ، درد، وقائم بن گئے ہیں۔

خمریات مومنؔ اگرچہ آزاد منش، عاشق مزاج اور رندطینت تھے مگر مے نوشی سے انھوں نے ہمیشہ احتراز کیا۔ اور کبھی ان کا دامن اس معصیت سے آلودہ نہ ہوا۔ شعرائے دہلی میں صرف غالبؔ ہی ایک ایسا شخص ہے۔ جو شرابخواری کے یا وصف شراب کا ذکر نہایت مزے سے لے کر بیان کرتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ مے وساغر کے مضامین باندھنے میں اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گیا ہے۔

مومنؔ باوجود اس کے کہ کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا مگر خمریاتی مضامین کی ان کے کلام میں کمی نہیں ہے۔ بعض جگہ شراب کے ذکر میں اتنے نادر اور اچھوتے خیالات

ادا کئے ہیں کہ خیام و حافظ کی صف میں جگہ دینی پڑتی ہے۔

اُردو شاعری میں شراب کے مضامین مختلف طریقوں سے بیان کئے جاتے ہیں کبھی تو شاعر خود اپنی بادہ پرستی کا ذکر کرتا ہے۔ اور کبھی معشوق درقیب کی۔ وہ کبھی واعظ و محتسب کو مورد عتاب بناتا ہے تو کبھی شراب کی تعریف میں رطب اللساں نظر آتا ہے۔ چنانچہ خمریات کے یہ تمام لوازمات مومن کے کلام میں موجود ہیں۔

محبوب شراب پیتا ہے تو لب ساغر کو لب محبوب سے واصل دیکھ کر خم صہبا کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ بات بالکل معمولی ہے مگر مومن نے اس مضمون کو بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے۔

منہ میں کیا خم صہبا کے بھر آیا پانی
تیرے لب سے جو لب ساغر سرشار لگا

بزم مے ہے محبوب شراب کا جام اُٹھا کر منہ سے لگاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر جرعہ جرعہ پیتا ہے یہ مومن سے دیکھا نہیں جاتا، جام کو محبوب کے ہونٹوں کے بوسے لیتا دیکھ کر زہر پینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

میں اس کی بزم مے میں زہر پی کر کیوں نہ مر جاتا
کہ میرے سامنے اس لب کے بوسے جام لیتا تھا

محبوب کسی بزم شراب سے سیاہ مستی کے عالم میں اٹھ کر آتا ہے۔ آنکھیں انگارے کی طرح سُرخ ہیں۔ چہرہ تمتما رہا ہے۔ اسے دیکھ کر مومن کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں انہیں اپنے معصوم محبوب پر شراب نوشی کا گمان گذرتا ہے تو یہ گمان قہر سے رنگت زرد ہو جاتی ہے

گمان نہ ہو اسے اپنا تو رنگ زرد ہے اور
سیاہ مستیٔ مے سے ہے چشم جاناں سُرخ

مومن کبھی شیشۂ شراب کو کبوتر بھی بناتے ہیں اور بدمستیٔ غم کا حال لکھ کر شیشۂ صہبا کے گلے میں باندھ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ مے کش پڑھ لے۔

لکھ کے بدمستیٔ غم تاکہ وہ مے کش پڑھ لے
باندھ دیتا ہوں سر شیشۂ صہبا کاغذ

مومن کی بد نصیبی دیکھئے ان کا محبوب جب کبھی اُن کے گھر آتا ہے۔ تو کہاں سے آتا ہے؟ اپنے گھر سے ان کے ہاں جانے کے لئے نہیں آتا۔ بلکہ رقیب کے گھر جا کے واپس لوٹتے ہوئے مومن کے پاس ہوتا ہوا جاتا ہے۔ اس لئے کہتے ہیں اپنی قسمت میں تلچھٹ ہی ہے۔ مئے ناب نہیں ہے۔ وہ تو عدو ہی کا حصّہ ہے

جب وہ بدمست ادھر آیا، عدو کے گھر سے
اپنی قسمت میں بجز دُرد مئے ناب نہیں

مومن نے اپنی شراب نوشی کے متعلق بہت سے شعر کہے ہیں اس پہ اُن کو خود بھی افسوس ہے۔

رات دن بادہ و مستم مومن   کچھ تو پرہیز گار ہونا تھا

بلا نوشی ایک پامال مضمون ہے ہر ایک شاعر نے اس کو مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے۔ مومن نے بھی اس مضمون کو بڑی عمدگی سے باندھا ہے۔ کہتے ہیں

دیکھتا کثرت بلا نوشی   کاسۂ آسماں ہے جام مرا
حوض میخانہ پینے سے بھی مرا جی نہ بھرا   کیا تنگ ظرف ہیں جو خم سے سبُو بھرتے ہیں

وہ نہ خم کدہ کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں
بتنگ آ کے حریفان بادہ خوار مجھے

بروز محشر بھی ہوش گر آیا	جائیں گے ہم شراب خانے کو

بھلا کیا اعتبار اے مومن ایسی پارسائی کا
کہ بیخود ہو گئے تم دیکھ کر تصویر شیشہ کی

شراب سے ہمدردی اور اسکے ضائع ہو جانے کا افسوس یہ بھی ایک پامال مضمون ہے مگر مومن اسے نہایت سلیقہ سے بیان کرتے ہیں

محتسب وہم ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے
نہ لنڈھا، پی لے، مئے ناب ہے، زہر آب نہیں

خاک میں حیف یہ شراب ملے	محتسب بادہ خوار ہونا تھا

محتسب اور زاہد چونکہ دونوں ہی شراب خواری کے دشمن ہوتے ہیں۔ اسلئے خمریاتی شاعری میں ان دونوں پہ بے حد بوچھاڑ کی گئی ہے۔ اردو فارسی کے شعراء نے خاص طور پر بڑی بے تکلفی اور دھڑلے کے ساتھ ان کی مذمت بیان کی ہے مومن بھی اس مضمون کو ادا کرتے ہیں مگر بہت رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ رکاکت اور بیہودگی کی جھلک تک نہیں آنے پائی

معشوق وہ ہے زاہد مفلس کو یاس ہے
قطع تعلقات کس امید پہ نہ ہو،

سوا اے محتسب اسکے کہ اپنے دل کی صورت ہے
سزاوار شکستن کونسی تقصیر شیشہ کی

یہ کیا طاقت کہ اب بھی محتسب پامال کر ڈالے
بلا تو خاک میں پڑ ہے وہی توقیر شیشہ کی

شراب کے عام مضمون بھی مومن نے نہایت بلند خیالی کے ساتھ ادا کئے ہیں یار دوست شراب پلاتے ہیں۔ مگر شراب پیتے ہوئے جو سرور حاصل ہوتا ہے تو مومن کا ذہن فوراً چشم یار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس یاد میں مرجاتے ہیں

میں مر گیا وہ چشم جو یاد آئی اور یار
حیران ہیں کہ مے تھی پیالہ میں سم نہ تھا

شیشہ سے شراب گرتی ہے تو اس کی قلقل سُنکر مومن کو اپنے محبوب کی بدمستی اور اس کا ہکلانا یاد آجاتا ہے۔

یہاں کہنا ہے ہکلانے کا اس بدمست کے عالم
دلے کیا سمجھئے بیہودہ ہے تقریر شیشہ کی

اسی طرح ایک جگہ اور کہتے ہیں۔

وہ گہ دل دیکھ یہ حالت ہوئی تغیر شیشہ کی
کہ قسمت ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیر شیشہ کی

ایک اور شعر اپنے خاص رنگ میں اور نہایت بلند کہا ہے۔

کیا جلوہ یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں
فکر مآل سے مٹے دشاہد رہے عزیز
پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں

جلتا ہوں ہجر شاہد و یاد شراب میں
شوق ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

اسلوب بیان

ایک چیز کو دیکھ کر مختلف لوگوں کے دماغ میں مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں، ہر شخص اپنے ماحول سے مختلف طریقہ پر اثر پذیر ہوتا ہے۔ زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ کے متعلق بھی ہمارا نقطۂ نظر قریب قریب ہمیشہ مختلف ہوتا ہے لیکن ہم میں سے بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نقطۂ نظر کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں پورے طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اگر اس کا کچھ حصہ بھی الفاظ میں سما گیا۔ اور مطلب قریب قریب ادا ہو گیا۔ تو مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس حصہ کو ادا کرنے کے لئے بھی وہ لاکھوں مرتبہ کے استعمال کئے ہوئے جملوں اور الفاظ کی ترکیبوں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں تاکہ پڑھنے والے ان جانے پہچانے جملوں اور ترکیبوں کی مدد سے مفہوم کا اندازہ کر سکیں۔ یہ الفاظ اور جملے پرانے گھسے ہوئے سکوں کی طرح ہوتے ہیں جن کو بلا کسی خاص کوشش کے سب پہچان لیتے ہیں۔ گو ان کے نقوش مٹ چکے ہیں اور پڑھے نہیں جاتے۔ لیکن یہی الفاظ جب ایک صاحب طرز کے قلم سے اس کی شخصیت کا اثر لئے ہوئے نکلتے ہیں تو ان کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تازگی اور کشش اور

تاثیر سے لبریز ہو جاتے ہیں در اصل یہی اسلوب بیان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

مومن کی شاعری نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں دو ذہنیتیں کارفرما تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں۔ ایک طرف اگر خیالات و واردات اور معنویت پر زور دیا جا رہا تھا۔ تو دوسری طرف زبان۔ رعایت لفظی اور خارجی پہلو پر رجحان صرف ہو رہا تھا۔ غالب اور آتش کے یہاں اگر پہلا طرز نمایاں تھا تو ذوق۔ نصیر اور ناسخ کے یہاں دوسرا لیکن مومن کی جدت پسند طبیعت نے ان سب سے ہٹ کر ایک علیحدہ رنگ اختیار کیا جس میں رشک آمیز سوز۔ داخلیت اور خارجیت کا لطیف امتزاج تخیل کی وسعت اور بیان کی لطافت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ان کے یہاں عام طور سے دو طرز بہت نمایاں ہیں ایک سادہ ہے دوسرا پیچیدہ اور دونوں ان کے اصلی اور حقیقی رنگ ہیں پیچیدگی کلام کا سبب مومن کی بڑھی ہوئی علمیت ہے لیکن غالباً اصلی وجہ جدت طرازی اور انفرادیت ہے وہ روش عام سے بالکل الگ رہنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے اس کا نفسیاتی سبب عشق کی پردہ داری بھی ہو۔

سادگی

مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھا ہے کہ "سادگی سے مراد صرف لفظوں کی سادگی نہیں بلکہ خیالات بھی ایسے نازک اور دقیق نہ ہونے چاہئیں۔ جن کے سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجائش نہ ہو۔ محسوسات کے شارع عام پر چلنا بے تکلفی کے سیدھے راستے سے ادھر اُدھر نہ ہونا اور فکر کی جولانیوں سے باز رکھنا اسی کا نام سادگی ہے"۔

در اصل جو سادگی کلام کا حسن اور زیور ہو سکتی ہے سو وہ مومن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں چند سادہ الفاظ میں معانی کا دریا موجیں لے رہا ہے۔ ذیل میں مومن کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں جس سے اس کا بخوبی اندازہ ہو گا۔

تیرے پردے سنے کی یہ پردہ دری — تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا
غم مرا کس لئے کہ دنیا میں — نہ رہا میں مرا فسانہ رہا
مدعا غیر سے کہا تا وہ — سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا — نہ ہے تو کسی کا نہ ہو گا کسی کا
کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں — کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

دیکھ لو شوق ناتمام میرا — غیر لے جائے ہے پیام مرا
ہو گئے یوسف جو دل چراتے ہو — کون ہو جائے گا غلام مرا

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا — دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا
شعلۂ دل کو ناز تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
شوق نے دور باش اعدا کو — اس کی محفل میں مرحبا جانا
پوچھنا حال یار ہے منظور — ہیں نے ناصح کا مدعا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا — تو نے مومن بتوں کا کیا جانا

ہم سمجھتے ہیں آئے مانے کو، عذر کچھ چاہیئے ستانے کو
صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ پھونک کر میرے آشیانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا سو مرے خاک میں ملانے کو
سن کے وصف اس پہ مر گیا ہمدم خوب آیا تھا غم بٹانے کو
کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں آسماں کے ستم اٹھانے کو

اک لحظہ نہیں قرار جی کو موت آئے بس ایسی زندگی کو
اس آفت جاں کو دل دیا ہائے جو عیب گنے ہے دل دہی کو
کوئی نہ رہا جو پونچھے آنسو کیا روؤں میں اپنی بیکسی کو

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی رہ گئی بات بے قراری کی
شکوہ دشمنی کریں کس سے واں شکایت ہے دوستداری کی
ہاں دیکھو کہ غیر سے کہہ دی بات اپنی امیدواری کی

مجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کر دیا مومن اس صنم کو خفا کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

اس تند و گُسل سے خود بگڑ جاتے　　گر عمر کا اعتبار ہوتا
دل بھر نے اگر کبھی مرے بھی　　کیا گردش روزگار ہوتا
اے بندہ شعار ہوش میں آ　　کوئی بھی ہے آپ خوار ہوتا
ہم کاہے کو دل کو جانے دیتے　　اپنا اگر اختیار ہوتا

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق　　سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق
اثرِ غم ذرا بتا دینا　　چارہ گر درد لادوا ہے عشق
آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے　　باوفا حسن بے وفا ہے عشق
سوچیے کیونکہ فریب دلداری　　دشمن آشنا نما ہے عشق

امتحاں کے لئے جفا کب تک　　التفاتِ ستم نما کب تک
غیر ہے بے وفا پہ تم تو کہو　　ہے ارادہ نباہ کا کب تک
جرم معلوم ہے زلیخا کا　　طعنۂ دستِ نارسا کب تک

وفا سکھلا رہے گا دل ہمارا　　تمہاری خاطر نامہرباں کو
کہاں ہے تاب نازِ برق اے کاش　　جلا دے آتش گل آشیاں کو
سمجھنا کیوں نہ دیوانے کی باتیں　　نہ پایا محرم اپنے رازداں کو
دلِ مضطر کی بیتابی نے مارا　　کہاں سے لاؤں اس آرام جاں کو

گر یہی بے خودی ہے صہبا میں — کون مشتاق سلسبیل ہوا
آسماں راہ پر نہیں آتا — دعوئ خضر بے دلیل ہوا
آپ کی کونسی بڑھی عزت — میں اگر بزم میں ذلیل ہوا
آتش آہ بے اثر سے مرے — آسمان گلشن خلیل ہوا
کوتہی کی جواب میں جوں جوں — اور بھی خط مرا طویل ہوا

صبر کر صبر ہو چکا جو کچھ — اے دل بے قرار ہونا تھا
وہ نمک پاش بھی نہیں ہوتے — یوں ہی دل کو فگار ہونا تھا
رات دن بادہ و صنم مومن — کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حال دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرض مضطرب مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

اس در پہ جو میں غبار ہوتا — نشگر دم شعلہ بار ہوتا

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ — غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم — کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں — کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
مانعِ ظلم ہے تغافلِ یار — بختِ بد کو خبر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو — شبِ عاشق سحر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہِ تاب شکن — دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے — وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

تسلی دمِ واپسیں ہو چکی — ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی
قلق کشتۂ سخت جانی ہے پھر — امیدِ اجل آفریں ہو چکی

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی — کتنی ہی طاقت آزمائی کی
رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
دامِ عاشق ہے دلدہی نہ ستم — دل کو چھینا تو دلربائی کی
گھر تو اس ماہ وش کا دور نہ تھا — لیک طالع نے نارسائی کی
مومن آؤ تمہیں بھی دکھلا دوں — سیرِ بت خانے میں خدائی کی

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی — ہم نے بھی جان دی پہ آہ نہ کی

کون ایسا کہ اس سے پوچھے کبھی
پرسش حال داد خواہ نہ کی

تھا بہت شوقِ وصل تو نے تو
کمی اے حسن تاب گاہ نہ کی

تابِ کم ظرف کو کہاں تم نے
دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی

گئے وہ آہ بے اثر دونوں
کس نے کشتی مری تباہ نہ کی

تھا مقدر ہیں اس سے کم ملنا
کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

دیکھ دشمن کو اٹھ گیا بے دید
میرے احوال پہ نگاہ نہ کی

مومن اس ذہن بے خطا پر حیف
فکر آمرزشِ گناہ نہ کی

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

موئے آغازِ الفت میں ہم افسوس
اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پہ وفا کی

وہ سوتے ہے بے حجابانہ رہے اور
نگاہِ شوق کام اپنا کیا کی

کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے
جفا پھر عدو لاؤں کہاں سے

بہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

شب وصل آپ کا عذر نزاکت
بجا ہے پہ نہ مجھ سے نیم جاں سے

مرے گھر آپ یوں جاتے تھے کس دن
اٹھاتا مدعا ہے آستاں سے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پہ اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں | نہ بادہ بدگماں اُس بدگماں سے
نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد | نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے
برا انجام ہے آغازِ بد کا | جفا کی ہو گئی خو امتحاں سے

خدا کی بے نیازی ہائے مومن
ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

مخدوفات ایرانی شعراء میں کہا جاتا ہے کہ فغانی سے قبل غزل میں صفائی وسادگی تھی۔ کسی بات کو زیادہ پیچ دے کہ نہیں کہتے تھے فغانی نے آکر اس طرز کو بدلا۔ سیدھی باتوں کو دقیقہ سنجی سے پہلودار اور لطیف بنا دیا۔ پھر عرفی، قدسی، نظیری وغیرہ نے اس کا اتباع کیا۔ اور یہ طرز عام ہو گئی۔ جدتِ تشبیہات و استعارات اور اختصار کلام بھی اس طرز میں داخل ہے۔ فغانی کے بعد وقوع گوئی و معاملہ بندی کو بھی شعراء نے اسی انداز میں شامل کیا اور یہ خاص مسلک بن گیا۔ شرف جہاں۔ علی قلی میلی۔ وحشی یزدی۔ ولی وغیرہ اسی راستے پر چلے اور غزل فارسی کا رنگ بدل گیا۔ اسی کے ساتھ شعرائے نازک خیال نے معنی آفرینی۔ دقت پسندی اور خیال بندی شروع کی مضامین تغزل میں موشگافیوں سے کام لیا۔ طالب آملی ظہوری۔ کلیم۔ جلال اسیر نے یہ طریقہ اختیار کیا اور اس کی بدولت غزل کی رنگینی، لطافت۔ نزاکت دلکشی اور شوخی انتہا درجہ پر پہنچ گئی۔ اردو غزل کی ترقی کے سلسلہ اور اسکی تدریجی رفتار کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے۔

مومن کسی واقعہ کے بیان میں اس کی درمیانی کڑیوں کو اکثر چھوڑ جاتے ہیں۔

اور بعض مرتبہ خیال کو اس قدر مشکل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کہ مطلب تک ذہن کی رسائی آسانی سے نہیں ہوسکتی۔ بقول ان کے۔

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

کبھی کبھی واقعہ کی درمیانی کڑی اس طور پر چھوڑ جاتے ہیں کہ سُننے والا نہایت آسانی کے ساتھ اس خلاء کو پُر کر کے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ صحیح ہے کہ غالب بھی اس صفت میں انکے شریک ہیں مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے بلکہ اکثر خیالات کی پرواز اور اسلوب بیان کی جدّت میں غالب بھی ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور کبھی جب ان کی نازک خیالی حدِّ اعتدال سے آگے بڑھ جاتی ہے تو معمہ بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے اُردو میں ان کے دشوار گذار راستہ پر کوئی نہ چل سکا۔ اب ہم اُن کے کچھ ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن سے اُن کی نازک خیالی اور پیچیدہ اسلوب بیان کا اندازہ ہوسکے گا۔ کہتے ہیں۔

وصل میں احتمال شادی مرگ
چارہ گر درد لا دوا ہے عشق

اس شعر میں مومن ایک پُورا جزو چھوڑ گئے ہیں صرف ایک مقدمہ جس میں احتمال کا اختلاف ہوسکتا ہے اسے بیان کر دیا ہے اور دوسرے مقدمہ کی پیروی کئے بغیر نتیجہ نکال دیا کہ "چارہ گر درد لا دوا ہے عشق"۔ یہ مسلّم ہے کہ ہجر میں عاشق کی جانبری ناممکن ہے۔ وصل کی بابت شاعر شادی مرگ کے قوی احتمال کو ظاہر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عشق کی زندگی دو حال سے خالی نہ ہوگی یا وصل ہوگا۔ یا ہجر۔ ہجر میں

مرنا مسلّم ہے وصل میں جان کا جانا اغلب ہے پھر اگر عشق لا دوا نہیں ہے تو کیا ہے۔

جیب درست لائقِ لطف و کرم نہیں

ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں،

ناصح کہتا ہے کہ اپنی جیب و گریباں کی حالت درست کر لوں لیکن اس کی دوستی بھی عداوت ہے کیونکہ اگر اسکے کہنے پر عمل کر کے چاک جیب و داماں میں رفو کر لوں گا تو پھر محبوب کے لطف و کرم کا اہل خود کو کیونکر ثابت کر سکوں گا۔ اس شعر میں یہ ٹکڑا کہ "ناصح ایسا کہتا ہے" بالکل محذوف ہے۔

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا

مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

مومن محبوب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ نیاز عشق کی پیشکش کر رہے ہیں۔ محبوب جس نے عدو کو بے جرم پائمال کر دیا ہے۔ مومن کی طرف مائل تو ہے لیکن اس خیال سے کہ مومن کو عدو کی بے جرم پامالی کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ کچھ رُک رُک کر مل رہا ہے۔ اس خیال سے کہ مومن اس واقعہ کے علم کے بعد ممکن ہے التفات کی قدر نہ کرے یا بدظن نہ ہو جائے مومن محبوب کی اس کیفیت کا اندازہ کر کے یہ خیال اسکے دل سے نکال رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ تو مجھے کوئی پرواہ نہ ہو گی۔ تم التفات کرو خواہ اس کا نتیجہ وہی کیوں نہ ہو جو عدو کو بے جرم پامالی کی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں

کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سے بدگمان نہیں

جب کسی کو سکتہ ہو جاتا ہے یا کسی کی موت کے متعلق پورا یقین ہوتا ہے تو اس کے چہرہ کے قریب آئینہ لے جاتے ہیں کہ اگر ذرا بھی سانس ہو گی تو آئینہ پہ نم پیدا ہو جائے گا۔ اور اس طرح حال معلوم ہو جائے گا۔ کہ واقعی مر گیا ہے یا نہیں

روز جزا خدا بت جلاد کو ملا
گویا کہ خونِ ناحق مومن ثواب تھا

بتِ جلاد نے مجھے بے گناہ قتل کیا حشر میں پرسش ہوئی۔ خدا کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ سوال و جواب کی نوبت آئی اس کی یوں تاویل کی کہ بتِ جلاد کو میرے خونِ ناحق کے سبب سے خدا ملا۔ گویا میرا قتل کارِ ثواب تھا۔ نہ مجھے قتل کرتا نہ وہ خدا تک پہنچتا یہ تو اس کے ظاہری معنی ہوئے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ میں ایسا گنہ گار تھا۔ کہ اگر معشوق مجھے بے گناہ قتل نہ کرتا۔ (یعنی اس کے ذریعہ شہادت نہ ہوتی اور شہید یقیناً جنتی ہوتا ہے) تو میری بخشش نہ ہوتی۔ چونکہ بتِ جلاد میری نجات کا باعث ہوا لہذا اسے ثواب ہوا اور اس کا یہ فعل ایسا تھا جس نے اس کو بھی خدا سے ملا دیا۔

بات شب کو اس سے منع بے قراری پر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

عاشق بیقرار تھا معشوق نے منع کیا کہ بیقرار نہ ہو اسے اپنی رسوائی کا خوف تھا۔ یہ حضرت سمجھے کہ یہ مطلب ہے "بیقرار نہ ہو تیری مراد پوری ہو گی" غلط فہمی پیدا ہوئی اور تکرار کی نوبت پہنچی۔ انہوں نے کہا لے اب تو میں بے قرار نہیں ہوں وعدہ وفا کر۔ معشوق نے کہا "ہائیں کچھ پاگل ہوا ہے کیسا وعدہ؟"

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

یعنی منجم نے نجوم کے ذریعے سے عاشق کی محرومی اور بدبختی کا پتہ لگا لیا اور اسکی ناکامیابی سے اپنی کامیابی کی توقعات پیدا کر لیں۔ اس طرح منجم عاشق کا رقیب بن گیا ہے۔ اور عاشق کا بخت ناساز منجم کے حق میں سازگار ثابت ہوا۔

رحم فلک اور مرے حال پر
تو نے کرم اے ستم آرا کیا

فلک سنگ دل مشہور ہے مگر معشوق نے ایسے ستم توڑے کہ فلک بھی کانپ اٹھا اور مظلوم عاشق کو رحم کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہیں سے مومن کا پیچ شروع ہوتا ہے۔ اب تیرا ستم ستم نہیں رہا بلکہ کرم ہوا کیونکہ فلک سے بے درد کو میرے حال پر مہربان کر دیا۔

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

اس شعر میں حد درجہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے یعنی جب ہم سوختہ ساماں خاک میں دفن ہوں گے تو فلس ماہی ہمارے لئے شمع گل شبستان ہو جائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ ہماری سوختہ بختی کے اثر سے وہ مچھلی جو قدیم خیال کے مطابق طبق زمین کے نیچے بالائے آب ہے اور حامل زمین ہے اس طور پہ کہ مچھلی گائے کو لئے ہوئے ہے۔ اور گائے کے سینگ پر طبق زمین ہے) جل جائے گی اور اس کے فلس گل شمع شبستاں کا کام دیں گے اور چونکہ مچھلی کی چربی کی شمع بھی بنتی ہے

اس قسم کے اشعار غالب کے یہاں بھی ہیں۔ مثلاً

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا،

لیکن مومنؔ کے یہاں تعقیدات کی بہت زیادتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے خلا کو پُر کرنے کے لئے بہت زیادہ غور کامل، و نگہ عمیق کی ضرورت پڑتی ہے بعض اوقات ذکی و ذہین اشخاص کے لیئے ان کے اس پیچ میں بڑی لطافت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور اس کے حل کرتے میں انہیں بڑا لطف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً

کیا رحم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا ۔۔۔ الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے ۔۔۔ میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری ۔۔۔ شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا
ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم ۔۔۔ حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا
عدو اس امید پر شاکی کہ شاید غصہ آجائے ۔۔۔ ملا دے خاک میں پر تو بھی شکرِ آسماں کیجے
تعلق کشتۂ سخت جانی ہے پھر ۔۔۔ امیدِ اجل آخر ہیں ہو چکی

خصوصیات

شعر و ادب میں خیال سے زیادہ "لفظ کی قدر ہے۔ کیونکہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیال بھی نامناسب لفظوں کے قالب میں ڈھل کر لغو بن جاتا ہے اور صرف لفظوں کی نشست اور تناسب سے معمولی بات بھی سحر حلال بن جاتی ہے۔ دُنیا کے جس زبان کے شاعر و ادیب کی تصنیفات اٹھا کر دیکھو تو محسوس ہوگا کہ خیال کے ساتھ الفاظ کا انتہائی عمل استعمال کیا گیا ہے۔ اور زبان کی نزاکتوں کو شعر و ادب میں سمو دیا ہے۔ الفاظ کا یہی تناسب اور آہنگ لب و لہجہ کی رُوح بن گیا ہے۔ ذیل میں مومن کے خصوصیات شاعری پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

نازک خیالی

علامہ شبلی کہتے ہیں کہ اگرچہ محاکات اور تخئیل شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے۔ مومن قدرت کی طرف سے ایک نہایت زبردست اور بلند پرواز تخئیل لائے ہیں اور مومن کا یہی کمال ہے جو انہیں مشاہیر کی صف میں جگہ دیتا ہے۔ در حقیقت مومن کی نازک خیالیاں ایسی ہیں جو شعر کی روح رواں کہی جا سکتی ہیں انہوں نے جس اختراع اور قوت ایجاد کے جوہر دکھلائے ہیں ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ اُن کی نزاکت تخئیل کی داد دیں اور اُن کے جواہر ریزے بہ بہ ناظر بن کر یں۔ مومن کے کلام میں تخئیل کی گلکاریاں نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔

عاشق کی رشک بازی نے خون کی ندیاں بہادی ہیں معشوق اس خیال سے کہ اس کا دامن خون سے آلودہ نہ ہو دامن اٹھائے ہوئے عاشق کی مزاج پرسی کے لئے آتا ہے۔ مگر اس کی یہ ادا کچھ اس غضب کی دلفریب واقع ہوئی ہے کہ دیکھنے والوں کی طرح تڑپ تڑپ کر فدا ہو رہی ہے۔ عاشق ناکام اس مرگ عالمگیر کا ذمہ دار اپنے اشک خوں کو قرار دیتا ہے جس نے یار کو خرام ناز پہ مجبور کیا۔

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے
سکھائی طرز اسے دامن اٹھا کے آنے کی

جاناں کی پیچ وخم زلف کے تصور میں عاشق از خود رفتہ ہو جاتا ہے اس خود رفتگی کے عالم میں اسے تمام مصائب سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملتا جیسے ہونا چاہیئے تھا۔ زلف برہم کے تصور سے جو خود رفتگی اس پہ طاری ہوئی اس نے تمام تکالیف کا احساس اس سے سلب کر لیا۔ اپنی سیہ روزگاری کا یوں مرثیہ پڑھتا ہے۔

خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

بلبل جسے شمع گل کا پروانہ کہا جاتا ہے۔ موسم خزاں کی نکبت اور نحوست میں گرفتار ہے۔ مومن کے یہاں عشق اور بدبختی دونوں مترادف ہیں۔ لہٰذا باغ میں خزاں کا تسلط اس لئے نہیں کہ خزاں اور بہار کوئی فطری موسم ہیں بلکہ باغ میں بلبل کا وجود ہی خزاں کا سبب ہے اگر وہ اب باغ سے علیحدہ ہو جائے تو فوراً ہی بہار خیمہ زن ہو۔

نازِ ہر بدبختی عشاق خزاں ہے بلبل
تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آجائے

خونِ رو رو کر عاشق کا دامن سبدِ گل فروش ہو چکا ہے محبوب کو یہ خیال نہ تھا کہ عشق بغانہ خراب کی نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اتفاقاً اس کی نگاہ خون آلودہ دامن پر پڑ جاتی ہے اور وہ آئینہ وار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتا ہے

داغِ خوں سے وہ ہے حیران ہوا
دامن اُلجھا ہے گلِ بے خار سے

خرامِ یار کو شعراء فتنۂ محشر سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں یہ ایک ایسا پامال مضمون ہے کہ کوئی معمولی شاعر بھی ایسا نہ ہوگا جس نے اس مضمون کو مختلف طریقہ سے نہ باندھا ہو مگر ذیل کا شعر کچھ استادانہ دبیر واقع ہؤا ہے کہ داد دیتے بغیر نہیں رہا جاتا اور مومن کی انفرادیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

چلنا تو دیکھئے کہ قیامت نے بھی قدم
طرزِ خرام شوخیٔ رفتار کے لئے

یعنی خرامِ یار کچھ اس طرح محشر بار اور حشر خیز واقع ہؤا ہے کہ قیامت کا عظیم الشان فتنہ بھی اس کے سامنے گرد ہے اور دنیا اس سے بھی زیادہ ہولناک سماں سے دوچار ہے جس کا وجود دامانِ قیامت سے وابستہ ہے

عشاق تنگیٔ دل کے ہمیشہ شاکی رہے ہیں اس گرہ کشائی کے لئے وہ ناخنِ یار کا تصور باندھا ہے لیکن دل خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جاتا ہے۔ عاشق

ناخن یار سے یوں خطاب کرتا ہے۔

دل ہؤا خون خیال ناخن یار
تو نے اچھی گرہ کشائی کی

گرہ کشائی کے لئے عام طور پر ناخنوں سے امداد لی جاتی ہے اور پھر دل کا خون ہو جانا اس لحاظ سے اور زیادہ دلآویز ہے کہ محبوب کے ناخن اس سے رنگے جائیں گے
مقتل میں جب وہ شمشیر بدست آتے ہیں اور عاشق پرواز کرتے ہیں تو اس سے ہوا میں جو چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ مومن اس کو برق سے تشبیہہ دیتے ہیں اور عاشق کے خویش و اقارب کے رونے کو بارش سے۔

کیوں نہ ٹپکے آب جب ٹپکے لہو
برق گرتی ہے تری شمشیر سے

عشق میں عاشق کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ میرا دل شعلۂ جوالا کے مانند سراپا اضطراب و سوز ہے۔ شعلۂ جوالہ میں سوز و اضطراب دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں۔ جب دل جل جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ تو مجھے آرام حاصل ہوگا یعنی عشق کے رنج والم سے مجھے نجات جب ہوگی۔ جب میں سرحد فنا میں قدم رکھوں گا

جی تھا برنگ شعلۂ جوالہ بے قرار
دل خاک ہو گیا مجھے آرام جب ہؤا

جذبۂ دل نے محبوب کو عاشق کے گلے لگا دیا۔ موقع گذر گیا مگر حضرت عاشق ہیں کہ شب و روز اُن کی آنکھوں کے سامنے یہ منظر ہے۔ اور حسرت و ارمان

کے لاکھوں طوفان انکے دل میں اُٹھتے ہیں اور مٹتے ہیں آخر جذبۂ دل کو محسوس کرکے اس سے خطاب کرتا ہے۔ کہ میں کیوں نہ تم کو چھاتی سے لگاؤں" اور پیار کروں کیونکہ تمہاری اور صرف تمہاری ہی وجہ سے محبوب میرے گلے لگا تھا۔

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر
آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اِک بار لگا

محبوب آئینہ دیکھنے کی تمنا کرتا ہے مگر عاشق بایں خیال مانع ہوتا ہے کہ وہ اپنا" عکس رُخ دیکھ کر سراپا حیرت ہو جائیں گے۔ اور یہ دلربا ادا خدا جانے اس کے دلِ زار پر کیا غضب ڈھائے گی۔ جب وہ حیرت سے تصویر بنے کھڑے ہوں گے۔

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

رقیب ہی تمام مصائب کا سرچشمہ ہے جب تک وہ زندہ ہے۔ عاشق کو ذرا امید نہیں کہ وصالِ یار ہو۔ ہاں اسے یہ امید واثق ہے۔ کہ اگر وہ فنا ہو جائے تو پھر شاہدِ مقصود سے ہم کنار ہونے کا بہت کچھ امکان ہے۔ امید و یاس کے اس پہلو کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

وہ ہے خالی تو یہ خالی - یہ بھری تو وہ بھری
کاسۂ عمرِ عدو حلقۂ آغوش ہوا

کہتے ہیں مرغ نے اذان دی اور محبوب عاشق کے پہلو سے اٹھ کر چلا گیا لیکن اس کے بعد جو کچھ عاشق پر گذری اس نے حشر کا نقشہ پیش کر دیا۔ مومن مرغِ صبح کو صورِ قیامت قرار دے کر اسے فتنۂ محشر سے تشبیہ دیتے ہیں۔

صور کھی منقار مرغ صبح پہلو سے مرے
وہ قیامت قد جو اٹھا حشر برپا ہو گیا

شب وصال ہے، عاشق نے شکوہ و شکایت کا دفتر کھول دیا ہے اور محبوب ہے کہ طعنوں کے تیر برسا رہا ہے اور عاشق کے دل کو زخمی کر رہا ہے اس لطف منظر کو یوں فرماتے ہیں۔

واں طعنہ تیر بار۔ یہاں شکوہ زخم ریز
باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

بسنت کی تقریب پر معشوق زرد پوش ہے اور عاشق بیموز گار غم ہجران میں گھل گھل کر زرد رنگ ہو گیا ہے۔ عاشق کی زرد رنگی کو اُن کے زرد پوشی سے جو بظاہر ہنگامی مطابقت پیدا ہو گئی ہے مومن اس کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

واں تو ہے زرد پوش۔ یہاں میں ہوں زرد رنگ
واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

سرو قامت معشوق کی زلفہائے پُرشکن کی درازی و طوالت کی تعریف اس قدر بے ساختہ انداز میں کی ہے کہ زبان سے بے اختیار کلمہ تحسین نکل جاتا ہے۔

پاؤں تک پہنچی وہ زلف خم بخم
سرو کو اب باندھئے آزاد کیا

آپ نے دیکھ لیا کہ مومن کی نازک خیالیوں نے زمین شعر میں کیا کیا گل کھلائے ہیں اور ایک معمولی سے معمولی سادہ خیال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے حقیقت میں

ان کا یہی وہ وصف ہے جس نے انہیں اپنے دوسرے معاصرین میں ممتاز کر دیا ہے

تشبیہات و استعارات | مومن کے یہاں تشبیہات بہت کم ہیں لیکن جہاں بھی کوئی تشبیہ بیان کی ہے۔ پورے زور اور تکمیل کے ساتھ۔ بقول آزاد۔ استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اُن کے کلام کو اور بھی اعلٰے درجہ پر پہنچا دیا ہے"۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کیا کیا شکن دیتے ہیں دل زار کو مگر
اسکے خیال میں ورق انتخاب تھا،

بالکل اچھوتی تشبیہ ہے لفظ شکن سے کیا کیا فائدے اُٹھائے ہیں۔ اور دل زار کو شکن دینے کی کیا پیاری توجیہ کی ہے۔ ورق انتخاب کو عموماً موڑ دیا جاتا ہے۔ مومن کا دل اس بنا پر دکھایا جاتا ہے۔ کہ وہ محبوب کی نظروں میں چڑھا ہوا ہے۔

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب
محو دود چراغ خانہ رہا

زلف کو دود چراغ کہنا کئی حیثیتوں سے پُر لطف ہے۔ مشبہ اور مشبہ بہ میں ایک وجہ شبہ حرکت ہے۔ دوسری سیاہی۔ اور تیسری پریشانی۔ پھر لطف یہ ہے کہ دود چراغ کی ترکیب فوراً خیال کو چراغ کی لو کی طرف لے جاتی ہے۔ جس کے مقابل یہاں محبوب کا چہرہ ہے۔

آتشیں آہ بے اثر سے مرے   آسمان گلشن خلیل ہوا،

تشبیہ کی جدت قابلِ داد ہے۔ آسماں کو کس خوبصورتی کے ساتھ گلشن خلیل ثابت کیا ہے۔

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن
نیند آتی ہے بآرام دگر آخر شب

واں تو ہے زرد پوشش یاں میں ہوں زرد رنگ
واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

لیکن تیری بسنت مستعار ہے اور میری بسنت اصلی ہے۔

داغ جدائی در دنداں وردے غزلت
ہے لیک شمع شعلۂ شمع رخسان شمع

کتنی مسلسل تشبیہ ہے

ربط اس سے ہے مثل شعلہ و شمع مرجاؤں گر ایک دم جدا ہوں

اس تمثیل سے کس نئے انداز سے یہ خیال ادا کیا ہے کہ وصل میں جلنا قسمت میں لکھا ہے اور ہجر میں مرنا۔

واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں
عالم شب وصال کے آنکھوں میں چھا گئے

محبوب کے روئے الورہ کی نالیش کو کس لطف سے بیان کیا ہے۔

ایک جگہ محبوب کی آواز کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

دشنام یار طبع حزیں پہ گراں نہیں اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

اس شعر میں کوئی تشبیہ و استعارہ نہیں ہے لیکن نزاکت آواز کا بیان

جس انداز سے کیا گیا ہے۔ اس میں وہی بلکہ اس سے زیادہ اثر موجود ہے جو ایک تشبیہ کے ذریعہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ اس سے بلند ہو کر انہوں نے تشبیہ بھی دی ہے لیکن وہ تشبیہ بھی کیفیاتی ہے

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

اسی طرح ایک جگہ کہتے ہیں

داغ خوں سے میرے وہ حیران ہوا　　دامن الجھا ہے گل بے خار سے

اس شعر میں تمثیل لطف تشبیہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ وہ اپنے دامن میں خون کے دھبے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ شعر کا مطلب صرف اتنا ہے۔ مگر تشبیہ نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب دامن یار کی نزاکت دیکھئے کہ وہ گل بے خار سے بھی الجھتا ہے۔

لگ ہچکی ہے سر زانوئے غم پہ ہے کہ یاد آیا
کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ قہ قہ کر

کسی کو زانو پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ یہاں بھی تشبیہ کا تسلسل دیکھئے ادھر وہ زانو پہ ہاتھ مارتے ہیں یہاں زانوئے غم پر سر ہے وہاں قہ قہ ہے۔ یہاں ہچکی بندھی ہوئی ہے

الفاظ و محاورات اکثر ایسے الفاظ و محاورات استعمال کرتے ہیں جو ذو معنی ہوتے ہیں۔ بظاہر ایک معنی سے کنایہ کرتے ہیں۔ اور دوسرے معنی جو پہلے سے زیادہ لطیف ہیں وہ بجائے خود خاص مزہ دیتے ہیں۔ ایسے

موقعوں پر اکثر صنعتِ ابہام سے کام لیتے ہیں۔

آنکھ عاشق کی کہیں پھرتی ہے اے وعدہ خلاف
دیکھ لے میں مرتے مرتے سوئے در دیکھا کیا

آنکھ پھیر لینا۔ دوسری طرف کو دیکھنا اور بے وفائی کرنا دونوں معنی میں یہاں صحیح ہے۔

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

پہلے مصرع میں آنکھ نہ لگنا بمعنی نیند نہ آنا ہے اور دوسرے مصرع میں آنکھ لگ جانا بمعنی عاشق ہونا ہے اور ظاہر ہے کہ عشق میں نیند اُڑ جاتی ہے۔

کیا روؤں خیرہ چشمی بختِ سیاہ کو
واں شغل سرمہ ہے ابھی یاں نیل ڈھل گیا

نیل ڈھلنا ہندی کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں نزع میں آنکھوں کا بے نور ہو جانا۔ پتلیاں پھر جانا کہتے ہیں وہاں معشوق سرمہ لگا رہا ہے یہاں نیل ڈھل گیا ہے معنی و محاورہ کے علاوہ سُرمہ و نیل میں رنگ کے لحاظ سے جو مناسبت ہے ظاہر ہے مگر پہلے مصرعہ سے اس لفظ نیل نے جو عجیب و غریب ربط پیدا کیا ہے اسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ نیل کی سلائی آنکھوں میں پھیرنے سے بصارت زائل ہو جاتی ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ شام وعدہ معشوق مصروف آرائش ہے مگر قسمت کی خوبی کہ اضطرابِ شوق نے عاشق کی حالت متغیر کر دی۔ سرمہ اور آنکھ کی رعایت سے بخت کی شکایت اِن الفاظ میں کرتا ہے کہ "کیا روؤں خیرہ چشمی بختِ سیاہ کو"

کس قدر بلیغ ہے جس نے پورے شعر میں تازگی کی ایک روح پھونک دی ہے۔

چھوڑ جلد اے بوالہوس سر کہ اب
جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے

سر پھوڑنا مر جانے سے کنایہ ہے۔ اور اصل معنی بھی یہاں درست ہیں۔ کہ سر مار کر روزنِ دیوار کو بڑھا دیئے۔ تاکہ حسبِ دلخواہ دیدار ہو۔ اگر بوالہوس نہ کہتے تو یہ معنی نہ پیدا ہوتے۔ جھانکتے ہیں کا فاعل معشوق ہے۔

کیوں نہ کاٹیں لب اطباء مر گیا حال پوچھا تھا ترے بیمار سے

لب کاٹنا۔ افسوس کرنا محاورہ ہے اور چونکہ حال پوچھنے میں اطباء کے لب مجرم ہیں۔ اس لئے ان کو کاٹنا اور سزا دینا بھی بامعنی بات ہے۔ یہاں دونوں معنی صحیح ہیں۔

پونچھے آنسو وارثوں کے کیا کہ دل اب ہائے ہائے
داغ میرے خون کا دامن سے چھوٹا جائے ہے

آنسو پونچھنا یعنی تسلی دینا۔ اشک شوئی کرنا کنایہ ہے۔ دامن سے داغ چھوٹنا جرم الزام سے بری ہونا بھی کنایہ ہے۔ دوسرے معنی حقیقی یہ ہیں کہ آنسوؤں سے داغ دھو دیا۔ قتل کی علامت مٹ گئی۔ بہت ہی پایۂ ناز شعر ہے۔

عرض ایماں سے ضد اس غارتگرِ دیں کی بڑھی
تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

اس شعر میں محاورہ "خدا سمجھے" نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اسی طرح غزلوں میں مومن نے جس طرح الفاظ کا اہتمام کیا ہے اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہ جوشش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی دقت تھا اثر کا سا

اس شعر میں لفظ "سا" جس اہتمام سے رکھا گیا ہے اس نے لطف معانی کو دوبالا کر دیا ہے۔

ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

اس شعر میں لفظ "کوئی" کی تنکیر نے ایسی خوبی اور دلکشی پیدا کر دی ہے جس نے تمام شعر بالخصوص پہلے مصرعہ کو سانچے میں ڈھال دیا ہے

اسے خو پڑ گئی ہے بے طرح زانوئے جاناں کی
یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہرے گا

اس شعر کے دونوں لفظ "بے طرح" اور "نہ ٹھہرے گا" کا انداز دیکھئے۔

جذبۂ دل کو چھپاتی ہے لگاؤں کیونکر
آپ وہ پھر سے گلے دوڑ کے اک بار لگا

چھپاتی ہے لگانے کے محاورہ میں معنوی خوبیوں کو دیکھئے تو شعر کتنا بلند ہو گیا ہے۔

جدت تراکیب | مومن کی دلکش فارسی تراشوں اور نادر ترکیبوں کی آزاد نے بھی تعریف کی ہے انہوں نے فارسی ترکیبوں سے کام لے کر کہیں شعر کی بندش کو چست کر دیا ہے۔ اور کہیں ایک وسیع خیال فارسی کی نئی ترکیب سے ادا کیا ہے چنانچہ مثالیں ہمارے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے

کافی ہوں گی۔

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

خموشی اثر افغاں۔ یعنی وہ فغاں جس کا اثر خموشی ہو۔

بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ
اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

بیمار اجل چارہ۔ یعنی وہ بیمار جس کا علاج صرف موت ہے۔ دیکھئے فارسی ترکیب لے نے شعر کی بندش کو کتنا چست کر دیا ہے۔

چرخ و زمیں میں تو یہ کا ملتا نہیں سراغ
ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں

سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر
کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

دیتے تکلیف شب ہجر میں آہ اپنے پاس
نقد جاں پیش کش مرگ کے قابل نہ ہوا

سر شک اعتراض عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

لگی نہیں ہے یہ چپ لذت ستم سے کہ میں
حریف کشمکش نالہ و فغاں نہ ہوا

کیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی
کیوں شور نالہ ہائے غرا بار کم ہوا

پہنچے وہ لوگ مرتبہ کو مجھے شکوۂ بخت نارسا نہ رہا

کیوں جور متصل سے تیرے غیر کھنچ گئے
میں کیا حریف کشمکش دمبدم نہ تھا

بیکاری امید سے فرصت ہے رات دن
وہ کاروبار حسرت و حرماں نہیں رہا

صبر بعد آسائش قلق پر مشکل تھا
عیش جاوداں اس رنج جاوداں اپنا

غیر سے سرگوشیاں کیجے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دل درد آشنا کہنے کو ہیں

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح
طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے - کم طالعی عاشق جانباز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

مثنوی۔ قصائد اور غزل میں مومن نے بہت سی نئی ترکیبیں ایجاد کی ہیں مثلاً خموشی اثر افغاں۔ اجل بیمار۔ آشوب گاہ حشر غم۔ جراحت زار۔ آئین سرا۔ زبان اجابت بیہودہ سری۔ دم خونابہ ریز۔ جادہ ریز۔ زخم ریز۔ نیز بار۔ رند خمکدہ کش۔ گرم

پائی برق تپاں۔ زبان بیہودہ سائل۔ گلہ بیز تکلّم۔ بے پروا خرامی حسرت فرماں روا بخت بخواب آسودہ۔ عقوبت ربا۔ قدم فرسا۔ خواب تمنا یاب۔ عشق جبلت زبون اضطراب۔ مصیبت بہرہ۔ قبول شوقِ دشواری پسند۔ رقیب آفرینیاں۔ میکدہ آشام۔ آہوئے رم خواب۔ جاں نہفتہ زار۔ نالۂ رخنہ ساز۔ اثر اہتمام چشم ستارہ بار شوق ہرزہ کار۔ اندیشہ خوں گشتہ۔ گرمیٔ شوق ثنا۔ ناز نالش۔ جو متصل بغفلت جراءت آزما۔ حریف کشمکش دمبدم۔ شوق شکوۂ اثر وغیرہ مثالیں طوالت کے خیال سے نظر انداز کی جاتی ہیں۔

حقیقت میں یہ ترکیبیں پاکیزہ اور نادر ہونے کے علاوہ رنگِ تغزل میں ڈوبی ہوئی ہیں بعض بعض جگہ ثقیل و نامانوس ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں لیکن بہت کم۔

مقطع مومن کی وہ خصوصیت جو اسے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ تخلص کا نباہ بھی ہے وہ حسن خوبی کے ساتھ اپنا تخلص مقطع میں لاتے ہیں۔ دوسرے شاعر کو یہ بات نصیب نہیں۔ گو کہ ان کا یہ تخلص ایسا ہے جو "کافر" یا "بت" یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ کے مقابل میں محض تخلص نہیں رہتا۔ بلکہ اور معنی بھی دیتا ہے مگر اردو میں اس قسم کے اور تخلص بھی ہیں جن سے دیگر شعراء نے فائدہ نہیں اٹھایا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر اُن کی اس خصوصیت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اور مومن کی جگہ پر کوئی دوسرا تخلص رکھ دیجئے تو شعر کے اندر کوئی معنوی نقصان نہیں پیدا ہو سکتا اور نہ اسکی لطافت میں کوئی کمی واقع ہو گی۔ لیکن پھر بھی دیکھئے کہ مومن نے اپنے اس تخلص سے کیا فائدہ اٹھایا اور مقطع میں اسے کس طرح چسپاں کیا ہے۔

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے جورِ اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہونگے

سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدمِ بت پہ — کعبہ ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر — مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

مومن تم اور عشقِ بتاں اے پیرِ مرشد خیر ہے — یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

جا کے کعبے میں بھی مومن نہ گئی دیر کی یاد — جائے لبیک صدا ہائے صنم کرتے ہیں

در بت خانۂ عشقِ بتاں اور آپ اے مومن
یہ حضرت آ گئی اک بار کیا طبعِ مقدس میں

کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرتِ مومن اب تمہیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبے کو جا مومن
صنم خانے میں کیا ہووے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن — کیجئے بس خدا خدا صاحب

ہیہات سجدہ ہائے صنم پہ دمِ وداع — مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

حورانِ بہشتی کو بتوں کا سا نہ پایا — مومن تجھے کیونکر ہو ایمان کی شکایت

وہ دن گئے کہ لاف و گزافِ جہاد تھا — مومن ہلاک خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو — کافر ہوا ہیں دین کے آداب دیکھ کر

مومن یہ عالم اس صنم جانفزا کا ہے — دل لگ گیا جہاں سراسر خراب میں

سب کو ہوتا ہے جہاں میں پاس اپنے نام کا ہم بھی اے مومن ہیں دل نذر صنم کیونکہ کہیں

شخصیت کا اظہار

ایک ادیب اور شاعر کی انانیت اس کی فکری انفرادیت کا ایک فطری سرجوش سا ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔ اگر وہ دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ ابھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ انسان کی تمام معنوی محسوسات کی طرح اسکی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طرح کی نوعیتیں رکھتی ہیں جس طرح ہر انسان کا ذہن و ادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا اسی طرح انفرادیت کا جوش بھی ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتا۔ دراصل مدارج کا ہی فرق ہے جو کہ تمام ادیبوں اور شاعروں اور ارباب فن میں موجود ہے۔ اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے مگر دھیمے سروں میں اور بعضوں کی اتنی پرجوش ہوتی ہے کہ جب کبھی بولتی ہے تو سارا گرد و پیش گونج اٹھتا ہے۔ چنانچہ جب مومن کہتے ہیں۔

شاعر بے نظیر ہوں سحر بیاں دبیر ہوں — دم ہے مرا نمونۂ معجزۂ پیمبری
سحر حلال گرچہ ہے جادوئے سامری محال — طور کلیم اوج فکر ید خدا فسوں گری
لاف زنی نہیں ہے یہ ہم نفسو کیا کروں — اس غم تازہ سے نہیں مجھ کو امید جانبری
کفر حکایت غرور اسکے بغیر یہ محال — تا نہ کہی گر جریدہ عار ہے مجھ کو ہمسری
مری زبان میں وہ بات نہیں کہ سخن پرست — کرے بیان میں وہ سحر جس سے فنون وہ بری
مری خلافت لساں مری فصاحت کلام — چارہ صد رہ و آزمانا زنیہ کنگھی و کہری
ہیں یہ معاند و حسود ہرزہ سرایہ زندگاں — ہاجی خویش و بے خبر مست بلغت کفت دری
ہیں یہ سگان جیفہ خوار شعر و سخن سے بے نصیب — کافر استخواں پرست طرفہ سگی و کافری

تو حقیقت میں یہ محض شاعرانہ تعلّیاں نہ تھیں بلکہ اُنکی پرجوش انفرادیت تھی جو بے اختیار چیخ رہی تھی۔ خود پرستی بری چیز کہی جائے لیکن خود شناسی کا شمار عیوب میں نہیں ہو سکتا۔ اسی خود شناسی نے مومن میں خود اعتمادی کی شان پیدا کر دی تھی۔ جس نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ وہ اپنے معاصرین میں کسی کو سخن گو تو کیا مشکل سے سخن فہم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جگہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔

مومن پیدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں وہ ہے لیک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

مومن تجھے تو وہم ہے مومن ہی وہ نہیں
جو معتقد نہیں تری طبع سلیم کا

اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور مومن نے غزل
دو ہی دن میں کیا یہ تو کیسا ماہر فن ہو گیا

مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو
جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا

حق تو یہ ہے کیا غزل اک روز مومن نے پڑھی
آج باطل سارے استادوں کا دعوےٰ ہو گیا

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

مومن سے اچھی ہو غزل تھا اس لئے یہ زور شور
کیا کیا مضامین للئے ہیں کس کس ہنر سے باندھ کر
پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومن
لگ اٹھتی ہے ایک بار آتش
وہ عشق بھی اور نہ وہ شوق ہے مومن
کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا
اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زبان غزل
جل جائیں جس کے رشک سے حاسد لبان شمع
مومن پہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے
جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ
شعر تر وہ ہیں مرے مومن کہ ہنگام جواب
خوف منہ اور زبان ہر سخن ور خشک ہو
مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو

اصناف شاعری

قصائد مومن کے قصائد پر کوئی مفصل بحث کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا چاہیے کہ تقاضائے قصیدہ گوئی کیا ہے اور مومن کے قصائد اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں صاحب علم الادب اور معجم رقمطراز ہیں کہ "قصیدے میں مدح کو شاندار الفاظ سے مرتب ہونا چاہیے بازاری اور مبتذل الفاظ سے قصیدہ گو کا بچنا اولین فرض ہے۔ ممدوح کی مدح میں ایسا مبالغہ نہ ہو کہ وہ ذم کی صورت اختیار کر لے۔ ممدوح کی شان اور اپنی حقیقت کو پیش نظر رکھنا بھی قصیدہ گو کے لئے ضروری ہے۔ ممدوح اگر بادشاہ ہے تو اس کا درجہ کم نہ کرے اور نہ اس قدر بڑھا دے کہ پیغمبری اور خدائی دیدے، قاضی یا امیر کی مدح کرے تو ان کو بادشاہ کے برابر یا اس سے زیادہ نہ کہے۔ حدودِ شرعیہ و نقلیہ کا لحاظ رکھنا بھی قصیدہ گو کیلئے ضروری ہے۔"

چنانچہ جب اس معیار سے ہم مومن کے قصائد کو جانچتے ہیں تو ہمیں اس کے اندر تمام خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ جہاں تک شوکت الفاظ، ندرت تشبیہہ، زور بیان، بلند پروازی، عالی خیالی، علوئے مضامین کا تعلق ہے ان کے قصائد بہت بلند واقع ہوئے ہیں۔ بلا مبالغہ ان کے قصائد فارسی کے چوٹی کے شعرا کے مقابل میں رکھے جا سکتے ہیں بعض قصیدے تو سلمان ساوجی کی طرز کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی استعداد کے اشخاص ان سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

مثال کے طور پر ایک قصیدہ درج کیا جاتا ہے جس کے اندر فلسفہ، شریعت،

شاعری بھی کچھ موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

الحمد لواہب العطایا | اس شور نے کیا مزہ چکھایا
والشکر لصانع البرایا | جس نے ہمیں آدمی بنایا
اب بھی نظر اس مجاز میں ہے | کیوں مہر نگاہ میں سمایا
نے عقل بسیط اس کا پرتو | نے نور مجرد اس کا سایا
سبحانک یا الٰہ عالم | عالم نے اعجبہ نے دکھایا
ہر جائے ہے تیرا جلوہ لیکن | دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا

ہاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو
پایا ہر شے میں پہ نہ پایا

مومن کے کل نو قصائد ہیں۔ ایک حمد ہیں۔ ایک نعت ہیں۔ ایک چار یار کی منقبت ہیں۔ ایک سیدنا امام حسینؑ کی شان میں۔ ایک معذرت ہیں اور ایک بسلسلۂ اعتراف احسان۔ یعنی نو قصیدوں میں سات قصیدے مذہبی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی کسی صلہ کی خواہش یا امید پر نہیں لکھے گئے ہیں۔ ثبوت میں وہ قصیدہ ملاحظہ کیجئے جس میں فرماتے ہیں۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری
سامعہ سوز دل خراش گریہ بیفزاد زخم دہنبر
نغمۂ نوک عندلیب قہقہہ گل ؟ تندی

مجھ کو فغاں سے کام ہے کیا ذکر ہیں اہل خانقاہ
دیر میں شورِ بید خواں میکدے میں نواگری
صبح کی جب بہار ہے ساقیٔ غنچہ لب کے پاس
مے ہے عذار لالہ رنگ لب ہے مذاقِ شکری
میرے یہ بخت ہائے بخت ایسے نصیب یا نصیب
چارۂ یاس امید حشر مرگ علاج مضطری
جانِ جہاں کو دل دیا دشمن جاں ہوا جہاں
سر میں ہوا نظر میں یاس سینہ میں آرزو بھری
یک دل و گوشہ گوشہ زخم یک تن و فوج فوج خصم
یک جگر و ہزار نیش یک سر و صد گراں سری

در اصل یہ قصیدہ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ راجہ صاحب نے ایک روز مومن کو بلوایا اور رخصت کے وقت ہتھنی کو لا کر اس پر بٹھا کر رخصت کیا۔

راجہ اجیت سنگھ نام کامروائے خاص و عام
جود سے جس کے با نظام کارِ جہاں کی ابتری
فیل نشیں بنا دیا خاک نشیں کو اس نے اب
خاک نہیں فلک کو زیب لاف و گزاف برتری

راجہ اجیت سنگھ کے نیزہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

رخنۂ سینہ کو چھید کے دل نکال لے　　مار سیاہ زلف سے ہو نہ سکے یہ دلبری

تیغ و تیر کی تعریف۔

خندۂ برق تیغ میں گرمیٔ مہر و ماہ تیر
گریۂ زخم تیر میں جوشش سحاب آذری

چند مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اسکے ادیم حشمت و مائدۂ جلال پہ
خستہ ذباب کی طرح طنطنۂ سکندری

جوشش طراوت و شمامۂ عطائے عزت و جاہ
لطف نسیم مشک بیز خلق شمیم عنبری

بوسہ روا بہ طریق سجدہ و فرق ہر فریق
منسلک در اس کا اک صنم رشک بتان آزری

تو وہ بہار باغ حسن جس پہ کیجیے نثار جاں
لالہ رخی سہی قدی گلبدنی سمن بری

لب کو مثال کس سے دوں لعل و عقیق بے مزہ
گل ہیں کہاں یہ نازکی مل ہیں کہاں یہ احمری

چشم کا تیری انغیانہ روح فزا نظر فزا
گریۂ دمستی نگار روح گلاب و عنبری

فصل بہار بعد یاس کس لئے غنچہ پھر ہوا
بزم میں تیری گر نہ تھی گل کو امید ساغری

جمع ہیں تجھ میں عدل و حسن جس سے خرابیاں خراب
مست شراب لب شراب محو پری رخی پری

دعائیہ اشعار کا انداز دیکھئے

تا رہے الفت آزمانانہ و غمزۂ دور دل ربا
تا رہے آرزو فزا طرز ادائے دلبری

قادر الکلامی اور حسن بیان ملاحظہ ہو۔

جور پہ تیرے جاں نثار غارتیان دین و حال

وصل سے تیرے کامیاب لب تشنگاں عسکری
تاکہ ہو نو بہار میں قسمت رند تشنہ باں
مستی و بے حجابی و نغمہ زنی و بے خودی
بہر سرود جام زہر ساغر مئے تیرے لئے
تا نہ ہو ناگوار طبع تلخیٔ بادہ شکری
رقص و سرود سے تری انجمن نشاط گرم
شعلۂ دود عارضِ روشن زلفِ عنبری
سوئے ہزار گوشش جاں رشتۂ زمیں بند فشاں
باغ میں جبتک اس طرح جلوہ کرے گُل تری
تجھ کو نصیب بزم میں داد دہی صلہ دہی
مجھ کو مبارک ایک سو مدح گری گدا گری

مومن عمر بھر مدح گری گدا سمجھتے رہے ۔ یہ صرف میرے راجہ کا بار احسان اتارنا تھا جسکے لئے اتنا زور طبع دکھایا گیا۔ لیکن پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ انکی ٹکر کے اردو میں بہت کم قصائد پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ایکسدوسرا قصیدہ ملاحظہ ہو جو ٹونک نہ پہنچ سکنے کی معذرت میں لکھا گیا ہے۔

یاد ایام عشرت فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی دربانی
خاک میں رشک آسماں سے ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی

گرد یا گرد دانش سپہر نے حیف — بعوض خاکی سپہر کیوانی

ایسی وحشت سرا میں آئے کیوں — سیل ہی کر رہی ہے ویرانی
کیا ہوئی وہ بلندیِ دیوار — کیا ہوئے وہ حصار طولانی
جائے گل ہیں چمن میں ریزۂ سنگ — کاہ کرتی ہے نازِ ریحانی
اٹھ گئے حوض و نہر غیر از چشم — ایک قطرہ نہیں پانی
نہ ملا کچھ نشانِ آبِ روان — خاک سا ہے جہان میں چھپانی،
سقفِ رنگین و زر نگار کہاں — نہ سپہر و نجوم نورانی،

گریز ملاحظہ ہو۔

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے — زرِ خورشید کی درخشانی
لے رہی ہے مری تجھے حاصل — کچھ نہ ہوگا بجز پشیمانی
جانِ مومن پہ گونہ گونہ ستم — کافر اتنی بھی نامسلمانی
تا کجا اے بپا بد شمر خصال — فتنہ ہائے فریب مردانی
اس سے کاوش نہ کر نہ ہو ظالم — آپ اپنا تو دشمن جانی
تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون — کھول دوں میں یہ رازِ پنہانی
مدح خوانِ شہِ وزیر لقب — ختم جس پہ ہوئی سخن دانی
پایہ سنجِ کمال اہلِ کمال — فارقِ قلزمی دعانی

گھوڑے کی تعریف اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔

شوخیِ یار کی سی چالاکی — نگۂ شوق کی سی جولانی،

انداز دعا دیکھیے کتنا پاکیزہ ہے۔

جب تلک باعثِ نشاط و ملال — ہے وصال و فراقِ جانانی
تیرے حساد رنج گوناگوں — تیرے احباب اور تن آسانی
تیرا اقبال روزافزوں ہو — جیسے مومن پہ لطفِ رحمانی

پروفیسر ضیا احمد صاحب بدایونی فرماتے ہیں کہ "مومن سے پہلے جس قدر شعراء گذرے ہیں قصیدہ میں باستثنائے سودا مومن کا کوئی ہمسر نہیں اگرچہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اُن کی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے۔ اور اسکے ساتھ ہر قصیدے میں تعلّی اور شکایت زمانہ کہ شعراء کی سنت ہے۔ اس شکوہ اور زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دھوکا ہوتا ہے تخلیص یا گریز البتہ نسبتاً کمزور ہوتی ہے۔ کلام میں عقیدت کی جھلک اکثر نظر آتی ہے۔ اور اسکے ساتھ کہیں کہیں مذہبی تعریض بھی کر جاتے ہیں۔ قصائد میں علمی مضامین بکثرت لاتے ہیں اور چونکہ نجوم و رمل و طب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اسلئے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اغلاق بڑھا دیتے ہیں۔ کہیں کہیں تلمیحات اور آیات و احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے ہیں اور عربی جملوں کو تو اس خوبی سے تضمین کر جاتے ہیں کہ انگوٹھی میں نگینے کا گمان ہوتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ مومن کے یہاں گریز نسبتاً کمزور ہے لیکن روانی کے بارے میں ایسا ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ذوق کی قصیدہ گوئی اس سے بہتر مثال پیش کر سکتی ہے مومن کی قصیدہ گوئی کی وہ خصوصیت جس کے وہ تنہا مالک ہیں ان کی تشبیب ہے جو حقیقی

معنوں میں تشبیب کہلانے کی مستحق ہے تشبیب کے لغوی معنی پر اگر نظر رکھی جائے تو اس انداز تغزل سے جدا نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی قصیدہ کے ہیں۔

تم اور عشرتِ ناز آہ کیا علاج کروں　　میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا　　غضب ہے شوقِ رسائی و دوریِ منزل
خدا سے ڈرائیے بیدرد ہے یہ کیا انصاف　　کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل
وہ تند خو کہ اگر جور سے پشیماں ہو　　تو پھر عذر کرے تا نہ ہائے تابِ تحمل

بد گمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ　　رازِ دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
دھوم ہے تا سقفِ خورشید قیامت کی مگر　　مجھ سے اللہ نہ پوچھے کا عذابِ شبِ تار
غیر کو بام پہ آ جلوہ دکھایا تم نے　　یہ نہ دیکھا کہ پڑا ہے کوئی زیرِ دیوار
بیمِ رسوائی و اندیشۂ بدنامی سے　　کیا کروں کر نہ سکا وحشتِ دل کا اظہار
شاد و شاد آئیے عیادت کو دمِ آخر تم　　ایسے بیدرد پہ کرتا ہے کوئی جان نثار
نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار　　چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار
آپ دیکھا نہ سنا اور سے پر جھوٹ نہیں　　تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

جوشِ وحشت ہے یہ ناصح نہ پہنا نا زنجیر　　دیکھ دیوانہ نہ ہو میں نہیں پابندِ رسوم
نوجواں حیف کوئی جاتا ہے جہاں سے ناشاد　　تازہ ہوتا ہے تجھے داغِ امیدِ مرحوم
کہہ دیا خواہشِ بیداد نے احوالِ تباہ　　تو تو ظالم نہیں زنہار یہ میں ہوں مظلوم

جب منا یا مجھے اس نے وہی الفت وہی دل
یہ غلط ہے کہ اعادہ نہیں بہد معدوم

مثنویاں

مثنوی ہی وہ صنف شاعری ہے کہ جو کسی اہل عجم کے لئے سرمایہ ناز ہو سکتی ہے یہی وہ شاعر ادب ہے جس نے فارسی کے ذخیرۂ ادب کو گراں قدر اور گراں بہا بنا یا جسکے ثبوت میں شاہنامہ۔ سکندر نامہ۔ منطق الطیر۔ بوستاں۔ زلیخائے جامی۔ تحفۃ العارفین مثنوی زلالی اور مثنوی مولینا روم پیش کی جا سکتی ہیں۔

فارسی کی تمام اصناف شاعری کے ساتھ یہ بھی ہندوستان میں آئی اور عالی دماغ شاعروں کے ہاتھوں دوسرے اصناف سخن کے ساتھ پروان چڑھتی رہی میر تقی میر نے خصوصیت کے ساتھ اس صنف کو ترقی دی اور ۳۰ سے زائد مثنویاں لکھیں جن میں بعض نہایت مختصر ہیں۔ مگر شعلۂ عشق۔ دریائے عشق۔ اعجاز عشق۔ شکار نامہ۔ اژدر نامہ۔ ہیمو لقا۔ تنبیہ الجمال وغیرہ مثنوی کے بہتر نمونے ہیں۔ میر صاحب کی مثنویاں بعض اعتبار سے نہایت عمدہ اور دلچسپ ہیں مگر سچ پوچھئے تو اس صنف سخن کو بام عروج پر پہنچانے والے میر حسن ثابت ہوئے۔ اور ان کی مثنوی کی اتنی شہرت ہوئی کہ میر صاحب کی مثنویوں کی شہرت صرف ان کی ذات بابرکات کی افضلیت کے ساتھ وابستہ رہ گئی۔ میر حسن کے بعد اگرچہ کئی مثنویاں بدر منیر کے جواب میں لکھی گئیں لیکن الہی تقصیر لیکن

اور شہرت نہ حاصل کر سکیں۔ آخری دور میں مثنوی گلزار نسیم کو لکھنؤ میں خاص شہرت ہوئی۔ مگر دلی میں رنگینی کے لئے کوئی دوسرا شخص مثنوی لکھنے والا نظر نہیں آتا یہاں تک کہ مومن و غالب کا زمانہ آجاتا ہے۔ مومن اور غالب دونوں نے اس صنف سخن میں نہایت جانکاہی اور محنت سے کام لیا۔ اور اس مردہ صنف کے ساتھ اعجاز مسیحائی کی۔ غالب نے فارسی میں گیارہ مثنویاں لکھیں۔ مگر مومن نے اس صنف شاعری میں جو کارنامے انجام دئے وہ آج بھی اردو ادب کے خزانے میں حسب ذیل ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ نالۂ مومن، دوسرا نامہ۔ شکایت ستم۔ قول غمگین۔ تف آتشین حنین مغموم۔ آہ وزاری مظلوم۔ مثنوی نالہ۔ مثنوی مضمون جہادیہ۔

مومن کی تمام مثنویاں باستثنائے چند سب کی سب عشقیہ ہیں اور اس طرز میں گویا وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انکی مثنویوں کے بعض بعض مناظر میر تقی میر۔ اور میر حسن کی مثنویوں سے ملتے جلتے ہیں۔ آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں یہ مثنویاں نہایت درد انگیز ہیں کیونکہ درد خیز دل سے نکلی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے جو غزلوں کا انداز ہے وہی اُن کا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مومن نے مثنویاں نہیں لکھی ہیں بلکہ دل کے چند جلے پھپھولے پھوڑے ہیں اُن کی مثنویوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسکے اندر واقعیت و اصلیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور شیفتہ کے خیال کے مطابق انکی مثنویاں انکی حیات معاشقہ کی منظوم تصویریں ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی کا وہ پہلو جس نے ان کے کلام میں پیدا کیا۔ اس سے صاف عیاں ہو جاتا ہے اسلئے ہم ان کی مثنویوں کو مشرق کی عاشقانہ مثنویوں کی صف میں جگہ دے سکتے ہیں جو اشخاص اُن کی مثنویاں

کو اخلاق سے گری ہوئی خیال کرتے ہیں۔ اور اس کی عریانی سے انہیں نفرت ہے۔ تو انہیں ہم معذور سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو شاید غزل کا ایک شعر بھی انہیں ایسا قابل نہ مل سکے گا جو اُن کے معیار پر پورا اترے۔ بہر حال انکی شہرۂ آفاق مثنوی زہرِ عشق کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین نہیں دیکھئے۔ آخری ملاقات کا کیا صحیح مرقع کھینچا ہے۔

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی۔
کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی

اس منظر کی حسرتناکی اگر بیان ہو سکتی ہے۔ تو اسکے لئے اس سے زیادہ بہتر الفاظ کہاں سے آئیں گے۔ عاشق و معشوق گفتگو کرنے کے لئے بیتاب ہیں لیکن مہر بہ لب، صرف زبانِ حال شرح آرزو کر سکتی ہے۔

دل کے حسرت زدگان بیکس	دو نوں بیٹھے ہوئے روتے رہے بس

آخری ملاقات میں وقت گذر رہا ہے اور زبان نہیں کھلتی ایک دوسرے کو حسرت زدہ دیکھتے ہیں اور روتے ہیں۔ عورت عورت ہے اسکے تاثرات مرد سے ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اسلئے مثنوی پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ جدائی معشوقہ پر کیا اثر کر رہی ہے اور کہ وہ اس سے کہاں تک متاثر ہیں۔ عورت کے لفظ لفظ سے اسکی محبت اور معصومیت ٹپک رہی ہے۔

....	پھر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو	مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
سب تم ادا دل سے لگا بیٹھو جی	نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی

توحید وجودی میں جو ہے کیفیت — ڈرتا ہوں یہ حیلہ خود پرستی کا نہ ہو

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

محروم حصولِ مدعا نے چاہا — حسرت زدہ محبتِ نارسا نے چاہا
مومن اس بت نے گر نہ چاہا نہ سہی — ہم خوش ہیں اسی میں جو خدا نے چاہا

اُنکی رباعیوں میں بعض جگہ اُنکی طبیعت کا اصلی رنگ موجود ہے۔ کہتے ہیں۔

بے شاہد و بے بادہ صبر تو بہ تو بہ
اس عمر میں دل پہ جبر تو بہ تو بہ
ایام شباب اور دلجوئی ساقی
فصلِ گل و جوشش ابر تو بہ تو بہ

اسی طرح کہتے ہیں۔

ہے عہدِ شباب زندگانی کا مزا — پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا — باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

حالانکہ یہ جوان مرگ مومن کا صرف زورِ طبیعت تھا۔ کہ جس نے یہ رباعی کہلائی ورنہ پیری تو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوئی۔

تشبیہ

مومن کی محبوبہ دل نواز کا انتقال ہوتا ہے۔ تو وہ بیقرار ہو جاتے ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ ان کی حیاتِ معاشقہ میں صرف ایک محبوبہ کی زندگی اُن کی پوری شاعری کی محرک

تھی حقیقت میں یہ اُنکی عاشقانہ زندگی کا دور نویں سال سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

یعنی طفلی سے ہوں میں پیرِ مغاں | بلد راہ گمرہانِ جہاں
تھے برس ہم شمارہ افلاک | کہ ہوا پائمال صورتِ خاک

ابھی دو سال بھی آرام سے نہیں گذرے تھے۔ کہ معشوقہ حورِ ملک شیم کا انتقال ہو گیا۔

آفتِ جان و دل، فراق و وصال | الغرض کٹ گئے یونہی دو سال
پھرِ تسکینِ شدتِ خفقاں | ٹھہری گلگشت روضۂ رضواں
گئی جنت میں بسکہ ایسی حور | ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

اسی طرح مومن نے اس کا مرثیہ غزل میں بھی لکھا ہے۔ یہ حقیقت میں مرثیہ نگاری کے لیئے نئی شاہراہ کھول دی ہے۔ اس مرثیہ میں بھی مومن کا کمال فن درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ محبوب کا ماتم موزوں اور دلدوز الفاظ میں کیا ہے اور پورا مرثیہ تاثیر اور درد سے لبریز ہے۔

دلی کی طرح سے یہ بھی چلی جاں کو کیا ہوا
دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا
سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے
کیا جانیے اس کی زلفِ پریشاں کو کیا ہوا
بیٹھی ہے اپنا خونِ دل افسوس سے حنا

اس دستِ رشکِ پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی
برہم ہے حالِ کاکلِ پیچاں کو کیا ہوا
بوئے قبائے یوسفِ گل ہے نسیم میں
اس کی شمیمِ عطرِ گریباں کو کیا ہوا
لذت فزا نہیں الم اس لب پہ کیا بنی
کچھ زخم بے مزا ہیں نمکداں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو
اس چشمِ رشکِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
دعوے ہے شوخیوں کا غزالوں کو دشت کے
اس خوش نظر کی جنبشِ مژگاں کو کیا ہوا
کتاں ہے سینہ چاک رخِ ماہ دیکھ کر
اس غیرتِ خورشیدِ تاباں کو کیا ہوا
عیب و حجابِ شمعِ رخانِ جہاں گیا
وہ مہرِ آسماں نکوئی کہاں گیا

کھو دی خزاں نے رونقِ گلزار ہائے ہائے
پژمردہ ہو گئے گلِ رخسار ہائے ہائے
پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب

نعش اس کی جلئے ہے سرِ بازار ہائے ہائے
سروِ فتادہ قامت محشر خرام ہے
کیا ہو گئی وہ شوخیِ رفتار ہائے ہائے
ہم خواب مہ جبیں کی مرے آنکھ مند گئی
کیا سو گئے ہیں طالعِ بیدار ہائے ہائے
وہ شمعِ مہر پر تو دمہ جلوہ بجھ گئی
دن رات ہے فروغِ شبِ تار ہائے ہائے
ہے کچھ خبر بھی گھر مرا ویران ہو گیا
سر پھوڑ و اپنا اے درو دیوار ہائے ہائے
اب پوچھے مجھ سے عاشقِ بیکس کی بات کون
اس میں نہیں ہے طاقتِ گفتار ہائے ہائے
روتا ہوں جان کو ملک الموت کی ذرا
کہہ میرے ساتھ تو بھی تو غمخوار ہائے ہائے
اے چرخِ یار کش تجھے پاسِ وفا نہیں
ہیں اور رنج و محنتِ آزار ہائے ہائے
نظارہ ہے محرکِ ماتم ہزار حیف
ابرو ہوا، بلالِ محرم ہزار حیف

واسوخت

مومن کی عاشقانہ طبیعت خصوصیت کے ساتھ اس صنفِ سخن کے لئے موزوں تھی۔ انہوں نے معشوقوں کی بے وفائیاں لکھی ہیں اور اُن کی کج ادائیاں بھی۔ واسوخت میں جو فرضی باتیں ہوتی ہیں وہ ان پر پوری طرح گذر چکی ہیں اس لئے ان کا واسوخت سوز و گداز کا جو مرقع ہے۔ ان کے کلیات میں کل تین واسوخت ہیں مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ زمانے کا اعتبار نہیں ۔۔۔ دورِ گردوں پہ اختیار نہیں
عشرتِ دہر پائدار نہیں ۔۔۔ چرخ کو ایک دم قرار نہیں

ہو نہ جائے ہماری بات بڑی
کبھی دن ہے کبھی ہے رات پڑی

زلف تھی ہم اثرِ شامِ غریباں کس دن ۔۔۔ صبحِ محشر تھا بھلا چاک گریباں کس دن
برقِ خرمن تھا کبھو خندۂ پنہاں کس دن ۔۔۔ سرمہ تھا نالہ ہائے شبِ ہجراں کس دن

خوبیٔ طرزِ تغافل کی غضب کاہے کو تھی
شوخیٔ جنبشِ مژگاں پہ نظر کاہے کو تھی

میں ہی تو رہا ہوں کہیں شب کو خوش و خرم ۔۔۔ میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم
میری ہی نظر سے ہے عیاں نیند کا عالم ۔۔۔ آتی ہے جماہی پہ جماہی مجھے ہر دم
انگڑائیاں لیتا ہوں یہ اب میں ہی تو پیہم ۔۔۔ میری ہی تو گردن میں پڑا جائے ہے کچھ خم

میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے
میری ہی جبیں ہے کہ جو گھٹنے پہ دھری ہے

تضمین!

مومن کی ہمہ گیر طبیعت نے شاید ہی کوئی صنفِ سخن ہو جس میں جولانی نہ دکھائی ہو۔ شیفتہ نے ان کے اسی زورِ طبیعت کو دیکھکر گلشن بیخار میں لکھا ہے۔ بزعم فقیر بقوت شاعری امثال کم کسے برخاستہ در ہر جنس آنچناں کلمنے وافی دارد کہ گویے در یک صنعت ہمہ عمر بسر نمودہ گرخطے از فہم خداداد داری بیا دیدیوانش نظر کن و تصدیق و تکذیب من زبان انصاف بکشا" خود مومن نے شیفتہ کی ایک غزل کی تضمین کی ہے۔ جس سے شیفتہ کی غزل کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ اسکے علاوہ حافظ نظیری۔ عرفی۔ کلیم۔ بیدل۔ قدسی کی غزلوں پر تضمین موجود ہیں۔

"تضمین شعر طوطئِ شکرستان ہند"

صبح دمید شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت ۔۔۔ روئے سحر سپید گشت یار بایں بہانہ رفت

تضمین کے دو تین بند ملاحظہ ہوں۔

ہائے نظر میں پھر گئیں شب کی سیہ مستیاں ۔۔۔ بادۂ سرخ رنگ کے فرش پہ ہیں کئی نشاں
تاب گسل خمار ہے نشۂ وصل اب کہاں ۔۔۔ سیلِ سرشک لالہ گوں چشم سے کیوں نہ ہو رواں
صبح دمید شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت ۔۔۔ روئے سحر سپید گشت یار بایں بہانہ رفت

جلوۂ بزمِ عشرت و رونقِ خانہ ہائے ہائے
زمزمہ و ترنم و رقص و ترانہ ہائے ہائے

ساقی و مطرب و مے وصلِ شبانہ ہائے ہائے
گردشِ چرخ حیف حیف دورِ زمانہ ہائے ہائے

صبح دمید و شب گذشت ماہِ شبینہ خانہ رفت
روئے سحر سیہ کنید یار بایں بہانہ رفت

مومن یا وہ گو حریف تو نہیں اپنے راز کا
رات کو یاں گذر ہوا اس بتِ دلنواز کا

وقتِ اذاں تلک رہا زمزمہ عیش و ناز کا
کس سے ادا ہو اب صلوٰۃ ہوش کہاں نماز کا

صبح دمید و شب گذشت ماہِ شبینہ خانہ رفت
روئے سحر سیہ کنید یار بایں بہانہ رفت

معمّے اور تاریخیں

مومن کی طبع رسا نے تاریخوں میں معمّے اور تخرجہ کو جن کا شمار عیوب میں ہوتا تھا محسنات تاریخ میں داخل کر دیا۔ مومن سے پہلے ان کے معاصرین نے بھی تاریخیں لکھی ہیں لیکن اعداد کو جمع کرنے کے علاوہ اور کوئی تکلیف گوارا نہیں کی۔ مومن کی تاریخیں شاعرانہ نزاکتوں سے مالا مال ہیں۔

تاریخ رحلت حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

فقر و دیں فضل و ہنر علم و عمل کے بے سر و پا کر دیجئے ۱۲۳۹ھ نکل آئے گا۔

"تاریخ ولادت دختر مومن"

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دختر مومن

دختر مومن سے نال کے اعداد خارج کر دیجیے ۱۲۵۹ھ نکل آئے گا

تاریخ وفات دختر

خاک بر فرق دولت دنیا من خشاندم خزانہ بر سر خاک

مادہ تاریخوں میں مومن نے اپنے والد حکیم غلام نبی خاں کی وفات کی تاریخ۔
"قد فاز فوزاً عظیما" اور جدہ کی تاریخ وفات "دخلت بالنعیم" سے نکالی ہے۔

گلشن بیخار کی تاریخ معہ قطعہ دیکھنے کی چیز ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ مومن نے اپنے شاگرد کی حوصلہ افزائی میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔

کیا تذکرہ شیفتہ نے لکھا ہے شیفتہ جس کے جانِ معنی!
یوں نکتہ شناس ہیں پر ایسا کوئی نہیں قدر دانِ معنی!
افکارِ بلند سے بنایا یہ چرخ بر آسمانِ معنی!
ہر فقرۂ نثر جانِ مضموں ہر شعر بروانِ روانِ معنی!
کیا بات ہے منتخب کی تیرے اے منتخبِ جہانِ معنی!
ہر نقطۂ انتخاب تیرا خالِ رخِ دلبرانِ معنی!
تیرے جو سخن سے ہے سرافراز الفاظ کا پایہ شانِ معنی!
معنی ہیں شناطرازِ الفاظ الفاظ مذیع خوانِ معنی!
ہے تذکرہ باریاضِ فردوس فردوس ہے با جہانِ معنی

اے تازہ بہارِ باغِ مضموں — اے گلشنِ بے خزانِ معنیٰ
مومن نے جب اسمیں دستہ باندھا رنگ کی — سیرِ گل و ضمیرانِ معنیٰ
آیا ہے خیالِ سالِ اتمام — تھا وہ کبھی تو باغبانِ معنیٰ
غنچہ کی طرح سے سر خرد تھا — یک غنچہ وہ ہم زبانِ معنیٰ
جب نغمہ سرا نہ ہو سکا وہ — دستانِ زنِ داستانِ معنیٰ

ہاتف نے کہا ہے اسکی تاریخ
گلدستۂ گلستانِ معنیٰ

سنہ ۱۲۵۰ھ

مومن کے معموں میں ایک معمہ لاجواب ہے اور بقول آزاد ایسا تو سنا نہیں گیا۔

معمہ باسم مہتاب رائے

بے کچھ نکر کے ہے سب کا رہ الٹا — ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

ہم۔ بات۔ یار کو الٹ دیجیئے "مہتاب رائے" نکل آئے گا۔

پہیلیاں

مومن کی طبعِ رسا نے جہاں تاریخوں اور معموں میں کمال دکھایا۔ وہاں کبھی کبھی بطور تفنن پہیلیوں سے بھی طبیعت بہلا لیتے تھے۔ چنانچہ گھڑیال کے متعلق ایک پہیلی درج

کی جاتی ہے۔

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بلائے
نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور پر دہ لٹکتا رہے
زمانہ کا احوال یکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے
اسی طرح سے مار کھایا کرے

موازنہ

ببل ورس نورڈ ( ) نے اپنی کتاب "اصول تنقید" میں لکھا ہے کہ "میرا خیال ہے کہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ مقابلہ و موازنہ ہمارے ان تمام فیصلوں کی بنیاد ہے۔ جو ہم فنون لطیفہ اور ادب کے متعلق قائم کرتے ہیں" یہ مقابلہ و موازنہ عمداً کیا جائے یا غیر محسوس طریقہ سے خود بخود بغیر کسی موازنہ کے ہم دو ادبی جواہر پاروں کو سامنے رکھ کر اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ان میں کون قابل ترجیح ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا بغیر موازنہ کے ناممکن ہے۔ اور اگر ہم ایسا کرتے وقت جذبات کو عقل پر ترجیح دے کر دلائل و براہین سے قطع نظر کر کے کوئی فیصلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو ہمارا فیصلہ کبھی وقیع نہ ہو گا۔

مومن اور فارسی شاعری

اب ہم ایران کے بعض نامور غزل گوؤں کے چند اشعار سے مومن کے تغزل کا مقابلہ کرتے ہیں۔

فارسی شاعری میں حضرت خواجہ حافظ کا جو پایہ ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں خواجہ صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں۔

یہاں ز ابروئے عید از ہلال وسمہ کشید
ہلال عید در ابروئے یار باید دید

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ ہلال عید کے جو لوگ منتظر ہیں اُن کو ابروئے دوست

دیکھنا چاہیئے۔ وہی سب کچھ ہے لیکن مومن جیسے عاشق بیتاب کو عید اور محرم کی کیا خبر وہ نظارے کے وقت فرط بےخودی میں دل کا اضطراب بھی پسند نہیں کرتا کہ مبادا اس یکسوئی نظارہ میں فرق آجائے۔ چنانچہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

نیم بسمل ہیں نہ چھیڑا اے تپش دل کہ ابھی
روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں

بہار مستی ریز ہے ابر بہار دُرپاش ہے مستیوں اور رنگینیوں کی بارش ہو رہی ہے ساغر و مینا بادہ آفریں ہیں ایسی حالت میں عاشق جانباز سے توبہ کی استدعا کرنا کس قدر بے محل ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
بہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

لیکن مومن اس دلکش منظر کی موجودگی میں بیہودگی کے ارتکاب کو یوں پائے استغفار سے ٹھکراتے ہیں۔

چرخ و زمیں میں توبہ کا ملتا نہیں سراغ
ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں

اسی طرح ایک جگہ حافظ صاحب کہتے ہیں۔

شراب لعل کشیں و روئے مہ جبیناں بیں
خلاف مذہب آناں جمال اینان بیں

گویا حافظ صاحب شراب پینے اور نظارہ یاد کرنے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں پسند کرتے لیکن مومن کے حلق کے نیچے شراب زہر کی طرح بھی ہجر میں

اٹھ نہیں سکتی۔

مے نہ اتری گلے سے جو اس بن مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

حافظ صاحب کہتے ہیں کہ معشوق کے کوچہ کی گدائی بادشاہی سے بہتر ہے۔

دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن

در کوئے او گدائی بر خسروی گزیدن

لیکن مومن کا عشق جنت پر کوئے یار کو اس طرح ترجیح دیتا ہے کہ مجال دم زدن باقی نہیں رہی۔

لگی ہیں اس کی نہ پھر آنے ہم تو کیا کرتے

طبیعت اپنی نہ جنت کے درمیان لگی،

فارسی شاعر معشوق کو اپنی محفل میں بلانے اور غیر کے ساتھ ملاطفت دکھانے اور عاشق کے جلانے کے لئے اس کو ایسے شخص کی معرفت بلواتا ہے جو عاشق کا گھر تک نہیں جانتا۔

با غیر نشینی و فرستی زپئے ما آں را کہ نداند رہ کاشانۂ ما

لیکن مومن کا رنگ دیکھئے کہ وہ مجلس میں موجود ہے رقیب کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے دیکھتا ہے اور اس پر اکتفا نہیں بلکہ عاشق کے جلانے کو معشوق عجیب لطیف انداز کی ادائی دکھاتا ہے۔

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف

دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

ارباب ذوق دونوں کے باریک فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔ اور مومن کے جذبات

کی داد دے سکتے ہیں۔

عشق، عاشق کو دلیر اور جانباز بنا دیتا ہے۔ اُس کو جان ایسی چیز کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی چنانچہ ایک فارسی شاعر کہتا ہے۔

تا سر ندھم پائے نشینم از سر کویش
نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

مومن اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

کشتۂ ناز بتاں روز ازل سے ہوں مجھے
جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

عشق میں عاشق کو معشوق پرستی کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں ہوتا۔ عشق ہی اس کا ایمان ہے عشق ہی اس کا مذہب ہے۔ فارسی شاعر اس مضمون کو یوں ظاہر کرتا ہے۔

دو عالم را بیک بار از دل تنگ
بدر کردیم تا جائے تو باشد

مومن نے اسی مضمون کو ایسے انوکھے انداز بیاں میں ادا کیا ہے کہ شعر موتی بن گیا۔

چارہ گر جنت میں اس کے آستاں سے لے گئے
ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر ٹپکا کیا

عاشق عشق کی مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ان کو عشق کا شعار جانتا ہے۔ فارسی شاعر کہتا ہے۔۔

نالہ از بہر رہائی نکند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

مومن اسی مضمون کو اس طرز میں ادا کرتے ہیں۔

اب قید سے امید رہائی نہیں رہی
ہمدرد پاسباں ہیں جو زندانیوں میں ہم

نظیری کہتا ہے۔

بہر مجلس کہ جا سازم حدیث نیکواں پرسم
کہ حرف آں مہ نامہرباں را درمیاں پرسم

لیکن مومن کا انداز دیکھئے

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

پہلے شعر میں ذکر معشوق بالکل معمولی رنگ میں ہے خود عاشق ذکر کرتا ہے اگرچہ اسکے لئے پیرایہ تلاش کرتا ہے۔ مومن نے ناصح کی نصیحت میں عشق کے مزے لئے ہیں۔ اس مضمون کو مومن نے کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ اسکے بلندئ خیال اور لطیف انداز بیاں نے فارسی شعر کے رنگ کو یک دم پھیکا کر دیا ہے۔

فارسی شاعر کہتا ہے۔

ایں جور دگر است کہ آزارِ عاشقاں
چنداں نمی کنند کہ بیداد خو کنند

مومن کہتا ہے۔

جب مجھے رنج دلِ آزاری نہ ہو — سب وشت پھر حاصل بیداد کیا

مضمون قریباً دونوں ایک ہیں مگر مومن نے اپنے شعر میں اثر کی بجلی بھر دی ہے

ایک معاملہ بند فارسی شاعر کہتا ہے۔

مستم کن آنچناں کہ ندانم زبے خودی
در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت؟

یعنی مجھ کو اس قدر بے خود بنا دے کہ یہ بھی خبر نہ ہو کہ میرے خیال میں کون آیا اور کون گیا؟ مومن کہتا ہے۔

ہم تا سحر آپ میں نہیں تھے — کیا جانے وہ کس کے گھر رہے رات

مطلب یہ ہے کہ شب کو ہمارے گھر رہے لیکن خوشی کے مارے ہم صبح تک آپے سے باہر رہے اور یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ وہ کس کے گھر رہے۔ ایک طویل مضمون کو قدرت ایجاز سے چند الفاظ میں ادا کر دینا مومن کا خاص انداز ہے فارسی شعر کا مضمون بالکل سادہ اور معمولی ہے اس کو معاملہ بندی میں مومن کے شعر سے کیا نسبت؟

فارسی شاعر کہتا ہے

یا زجاناں یا زجاں بایست دل بر داشتن
رسم عاشق نیست با یک دل دو دلبر داشتن

یعنی یا تو معشوق سے ہاتھ اٹھاؤ یا جان سے دست بردار ہو جاؤ کیونکہ ایک دل ہو اور دو دلبر ہوں یہ عاشق کا شیوہ نہیں۔

مومن کا شعر ہے۔

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ

دل میں کچھ تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

اس میں شک نہیں کہ فارسی کا شعر اپنی شیرینی و دلکشی کے لحاظ سے بہت خوب ہے لیکن با ایں ہمہ اس شعر کے مقابلہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔

نظیری کا مشہور شعر ہے۔

بہ بدی در ہمہ جا نامِ برآرم کہ مباد

خونِ من ریزی و گویند سزاوار نبود

یعنی میں ہر جگہ اپنے آپ کو بدنام کرتا پھرتا ہوں کہ مبادا تو مجھے قتل کر دے اور لوگ مجھے کہیں کہ قابلِ قتل نہ تھا۔ اور تو مجرم ٹھہرے۔ مومن کا شعر ہے

بہر گناہ جرأتِ پابوس تھی ضرور

کیا کرتے وہم خجلتِ جلاد آگیا

مطلب یہ ہے کہ ہم کو جلاد بے گناہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس پر ہم کو خیال آیا کہ قتل کے بعد اس کو ندامت ہوگی اس وجہ سے ہم نے جرأت کر کے اس کے پاؤں کا بوسہ لے لیا۔ اور مجرم بن گئے۔ اب جلاد کو شرمندگی کا موقع نہ ملے گا۔ لیکن مومن کے مضمون سے نظیری کے اس شعر کو کوئی نسبت نہیں

فارسی شاعر کہتا ہے۔

اظہار کہ دم مہرد در اندیشۂ آنم

آں نامہہ باں از غیرِ پنہاں میکند یا نہ

شاعر اس خوف سے پریشاں ہے کہ معشوق سے جو رازِ محبت کہہ چکا ہے اس کو

وہ غیر سے کہد ے گا۔ مگر مومن کہتا ہے

راز نہاں زبان اغیار تک نہ پہنچے
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچے

انصاف کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو فارسی شاعر کے سادہ مضمون کو مومن کے نازک تخیل اور حسن اسلوب سے کوئی واسطہ نہیں

اسی طرح فارسی کا دوسرا شعر ہے۔

بہ جاناں نامہ ہرگز عاشق بیمار نہ نویسد
کہ از بے طاقتی یک حرف را صد بار بنویسد

مومن کہتا ہے

حال دل یار کو لکھوں کیونکر ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

مومن کے اس طرز بیان کی داد نہیں دی جا سکتی اس کا لطف بیان سے باہر ہے۔

فارسی شعر ہے

کاشکے ہائے محرم نمی پرسیدیم کاں مہ کجاست
ایک سخن گفتی و باز از صد گمانم سوختی

مومن کہتا ہے۔

روز کا بگاڑ آخر جان پہ بنا دے گا اس کو شوق آرائش دل ہے بدگماں اپنا

فارسی شعر ہے۔

تا مرا در نظر مدعیاں خوار کنند ہرچہ گویم بخلاف سخنم کار کنند

مومن کہتا ہے۔

آتش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ　　میں ہوں کشتہ ترے تغافل کا

مومن کے ہر شعر میں فارسی کے اشعار سے بہت زیادہ مضمون ہے اور اس پر زور کلام اور رنگ تغزل، زبان کی صفائی اور اُن کے دلکش اسلوب بیان نے مزید اضافہ کر دیا ہے

مومن اور عربی شاعری

شاعری عرب کا طرۂ امتیاز رہی ہے وہاں کا ہر مرد و عورت فطرۃً اس وصف سے موصوف تھا۔ ان کے نزدیک غزل کے معنی عورت سے اظہار عشق کے ہیں اس لئے عرب کا تغزل اسی دائرہ میں محدود رہا اور صنف غزل مردوں کے ساتھ مخصوص ہو گئی۔ عورتوں کے اشعار میں تغزل کا کہیں نشان تک نہیں ملتا بعض سہاگن عورتوں نے جو شوہر کی مفارقت و شوق ملاقات میں اشعار کہے ہیں اس کو موضوع تغزل سے خارج سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اسکے اسباب عشق اضطراری کے سوا اور بھی ہو سکتے ہیں عرب میں صدہا بلکہ ہزارہا نامور عشاق گزرے ہیں اور سب نے عشقیہ جذبات کو غزل میں ادا کیا ہے۔ جن کے کلام و احوال کی تفصیل سے "مصارع العشاق" "تزئین الاشواق"۔ دیوان ابی محجلہ و کتاب الاغانی حماسہ و شعراء الجاہلین کے صفحات بھرے پڑے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ قدیم شعراء کے عرب کا پایہ غزلگوئی میں نہایت بلند ہے انہوں نے صنف غزل میں ہر قسم کے مضامین نہایت خوش اسلوبی سے ادا کئے ہیں اُنکی غزل مدرانہ کار تخیلات اور دقت آفرینیوں سے پاک ہے۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے

لَئِن سَاءَنِی اَن نِلْتَنِی بِمَسَاءَۃٍ
لَقَدْ سَرَّنِی اَنِّی خَطَرْتُ بِبَالِکَ

یعنی یہ ضرور رنجیدہ بات ہے کہ اے معشوقہ تو نے مجھ کو برائی کے ساتھ یاد کیا لیکن میں اس پر خوش ہوں کہ تیرے دل میں میرا خیال تو آیا۔ عربی شاعر ناصح اور ملامت گروں سے نہایت برہم رہتا ہے اور ان سے سخت لہجہ میں گفتگو کرتا ہے اور یہ غزل کا ایک اہم جزو ہے متنبی کہتا ہے۔

اَاُحِبُّہٗ وَاُحِبُّ فِیْہِ مَلَامَۃً
اِنَّ الْمَلَامَۃَ فِیْہِ مِنْ اَعْدَائِہٖ

یعنی جبکہ میں محبوب کو دوست رکھتا ہوں تو اس کے عشق میں ملامت کو کب پسند کر سکتا ہوں کیونکہ ملامت یقینًا محبوب کے دشمنوں کی طرف سے ہوا کرتی ہے۔" یہ کتنا سچا اور دلکش مضمون ہے لیکن اس میں ایک دوسرا پہلو بھی پیدا ہوتا ہے جس کو مشہور شاعر ابوالشیص نے ظاہر کیا ہے

اَجِدُ الْمَلَامَۃَ فِی ھَوَاکِ لَذِیْذَۃً
حُبًّا لِذِکْرِکِ فَلْیَلُمْنِی اللُّوَّمُ

یعنی اے معشوقہ تیرے عشق میں ملامت بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں تیرا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ بس ناصحوں کو چاہیئے کہ مجھے خوب ملامت کیا کریں" اسی طرح کا ایک اور شعر ہے۔

لحب الحدعا ائکر اسمہ   حلاوۃ الحبیب علی مسمعی

یعنی نصیحت کرنے والے کی نصیحت اس لئے پسند کرتا ہوں کہ بار بار دوست کا

نالہ سننے میں آتا ہے
ایک دوسرا شاعر کہتا ہے۔

حبری حبّها مجاری دمی فی مفاصلی
ناصح لی عن کل شغل لها شغل

یعنی دوست کی محبت بجائے خون کے میرے اعضا میں دوڑتی ہے اسی لئے
تمام اشغال کے عوض مجھ کو اس کا شغل ہے۔

مومن خاں کے دقیق و نازک خیالات میں ایسے مضامین تو مل نہیں سکتے البتہ جہاں
کہیں انہوں نے سادگی ادا کا پہلو غالب رکھا ہے۔ اور لطافت خیال کے ساتھ صفائی
بیان کا جوہر دکھایا ہے۔ وہاں ایسی ادائیں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں کہ کسی معمولی مضمون کو
طرز خاص میں ظاہر کرتے ہیں اور ایک سطحی خیال میں کوئی لطیف پہلو دکھا دیتے ہیں۔
مذکورہ بالا شعر کے مفہوم کو ذہن نشین کر لیجے لہذا اشعار ذیل کے مفہوم پر نظر کیجے
اور مومن کی نازک خیالی کی داد دیجئے۔

کیا جی لگا ہے تذکرہ یار میں عبث ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

مانوں گا نصیحت پہ نہ سنتا میں تو کیا کرتا کہ ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

چشمک میری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

حبیب دوست لائق لطف و کرم نہیں ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

مومن اور ہندی شاعری

عام قانون فطرت یہ ہے کہ ہر ذی رُوح کا نر سراپا پرستش دنیا ز ہوتا ہے اور مادہ سراپا عشوہ پذیرائی۔ چنانچہ یہی اصول فطرت انسانوں میں بھی جاری ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ کا مرد عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس سے نازو حسن کی بھیک مانگتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی دل باختہ شاعر نے اپنے قلب میں جذبات لطیف کی تڑپ اٹھتی دیکھی ہے تو وہ ہمیشہ عورت کی ہر جنبش ابرو کا پرستار نظر آیا ہے یورپ میں قرون وسطیٰ، عرب میں بعثت سے پہلے کی یا کسی اور سرزمین کے دور وحشت وجہالت کی شاعری کو اٹھا کر دیکھئے آپ کو یہ حقیقت صاف طور سے نظر آئے گی۔

صرف دُنیا کے اندر ہندوستان ہی ایک ایسا گوشہ ہے۔ جہاں اس کلیہ کے خلاف عمل کیا گیا یعنی یہاں جذبات عشق مرد کی جناب سے نہیں بلکہ عورت کی زبان سے پیش کئے گئے ہیں، اور مرد اپنی متاع صبر و ہوش کو خیرباد نہیں کہتا۔ بلکہ عورت اپنے دل کی دنیا اُجاڑتی ہے۔ یہاں مرد کسی کے چشم و ابرو کا گھائل نہیں ہوتا۔ بلکہ عورت کسی کے ناز و کرشمہ کا شکار بنی مرغ بسمل کی طرح تڑپتی رہتی ہے۔ چنانچہ ہندی شاعری اسی قسم کے جذبات سے لبریز ہے۔

ہندی کا مشہور شاعر بہاری کہتا ہے۔

پوس ماس بسنی سکھین پیے سائیں چلیت سوار
گہی کر بین بیہ دین تجیار و ہوہ راگ ملار

ترجمہ، پوس کے مہینہ میں سکھیوں سے یہ بات سن کر پیارے علی الصباح پردیس کو جائیں گے۔ اس چالاک عورت نے بین لیکر ملار کی راگ الاپی ملار کے راگ سے پانی برستا ہے مطلب یہ ہے کہ معشوق سفر کو نہ جاسکے۔

بہاری کا دوسرا شعر ہے۔

ناجو بدہی تنو اچیہ سوچھ رکھنے کاج
ورگ پگ پوچھین کو کیئے بھوشن پاانداج

ترجمہ جسم کی خوبصورتی قائم رکھنے کے لئے خدا نے پائے نگاہ کے صاف کرنے کیلئے زیور پا انداز بنایا۔

شعر ہے۔

چھومی نہ شتشو تا کی جھلک جھلکیو جوبن رنگ
دیپتی دیہہ دوں ملی دیپتی تابھف رنگ

ترجمہ۔ لڑکپن کی جھلک نہیں گئی تھی کہ جسم پر جوانی کا رنگ چڑھ گیا۔ دونوں کے ملنے سے جسم تانبہ کی طرح چمکنے لگا۔

میرا ن کہتا ہے۔

تم بن ٹے نی کو ن گریے کر پامو پر ہاتھ — مو ہلیہ گیل جان کے دُکھ کر دہنو ساتھ

خسرو کہتا ہے۔

خسرو اپنا سوہاگ کی جاگی پی کے سنگ — من مورے من پیو کو دو دھ بھئے اک رنگ

ترجمہ۔ اے خسرو میں نے شب وصال معشوق کے ساتھ جاگ کر بسر کی میرا جسم اور اسکی روح دونوں مل کر ایک چیز بن گئی تھی۔

سنی رام کا شعر ہے۔

چلت لال کے میں کیو سنجی ہیو پرشان   کاہ کہوں در کت نہیں آتے ویوگ کرشان

ترجمہ۔ معشوق کی جدائی کے وقت میں نے اپنا کلیجہ پتھر کا بنا لیا۔ کیا کہوں کہ وہ آتش فراق سے پھٹ کیوں نہیں جاتا۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

تارے گنت گنت ہوں ہاری   ٹپکن لاگے نین

ترجمہ۔ تارے گنتے گنتے میں ہار گئی۔ آنکھیں ٹپکنے لگیں۔

اب ان اشعار کو ذرا ملاحظہ فرمائیں اسکے بعد ایک نظر مومن کے کلام پر بھی ڈالئے مومن کے حسب ذیل اشعار قابل غور ہیں۔

وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں کیا   یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

کاٹ لینے دو گلا تم شوق سے گھر جائیو   ایک رقص نیم بسمل کا تماشا دیکھ کر

وقتِ وداع آہ گلا کاٹ رہے تھے   کیا کھینچتے دامن کو ترے کام میں تھا ہاتھ

ہندی کے شعر میں پانی برسانے کی فکر کی جا رہی ہے تاکہ معشوق سفر سے باز آ جائے۔ آپ کو قابو میں لانے کی کوشش ہے لیکن معشوق پہ کچھ زور نہیں چلتا۔ اُردو کے تینوں شعر دیکھیے کہ "سفر" کا اثر ہے۔ اور معشوق کو سفر سے باز رکھنے کے لئے

کیسی کیسی جانبازی دکھائی جارہی ہے۔

اک نگاہ سرسری دیوانہ ہم کو کر گئی گردش چشم پریوش ساحر بنگالہ تھا

ہندی شعر میں معشوق کے تن کی نزاکت بیان کرنے کے بعد خاموشی ہے، اردو میں صرف آنکھوں کی حقیقت بیان کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اس کا اثر دل پر کیا ہوتا ہے۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

خواب میں کیا خوش ہو یوسف کو زلیخا دیکھ کر
کھل گئیں آنکھیں تجھے اے جلوہ آرا دیکھ کر

جوں نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشین کا دیکھ کر

ہندی اور اردو مذاق کا فرق ظاہر ہے اور دیکھئے مومن نے اپنے دونوں شعر کہاں سے کہاں پہنچا دیئے ہیں

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

ہندی شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں بلکہ دکھ بھی ساتھ ہے۔ اردو شعر کا مضمون کیا دلنشین اور کس قدر بلند ہے۔

بے خود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

دونوں کا رنگ جدا ہے۔ حضرت امیر خسرو نے وصال کی جو کیفیت بیان کی ہے

مومن نے اس میں ایسی بات پیدا کی ہے جس کا جواب دنیائے شاعری میں نہیں

وہ چلا جان چلی وہ دونوں یہاں سے کھسکے

اسکو تھامو ں کہ اسے پاؤں پڑوں کس کس کے

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا۔

اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

تارے گنے بدلے گن کے شب تار کاٹ دی — ایام ہجر میں مرے کیا کام آئے داغ

مومن اور مغربی ادبیات

یورپ کا تخیل محسوسات کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتا۔ وہ ہمہ تن مادیت ہے اس لئے اس کی نگاہیں صرف مادی مناظر کی جلوہ شناس ہو سکتی ہیں؛ بیشک طائران خوش الحان کی زمزمہ سنجیاں اسکے نغمۂ خیال میں ایک لحن آفریں تموج پیدا کرسکتی ہیں۔ لیکن قلب شکستہ کی صدا اس کو شعلہ فشاں نہیں بنا سکتی۔ ماہ وخورشید کی جلوہ گری اس کے ذوق نگاہ کو نور انبساط سے معمور کر سکتی ہے لیکن یوسفستان محبت کی گندم آمیز فضا اسکے لئے بالکل تاریک ہے۔ نسیم سحر کے دلآویز جھونکے اسکے خیابان آرزو کو گہوارۂ بہار بنا سکتے ہیں۔ لیکن کوثر و تسنیم کی موجیں اس کو نشاط معنوی سے سیراب نہیں کر سکتیں۔ قوس و قزح کی بوقلمونیاں اسکے ملک سخن کو نقش ہائے رنگا رنگ سے آراستہ کرسکتی ہیں لیکن خونابۂ دل کی تراوش اس کو اسرار رنگیں کی نورانی مشعل نہیں بنا سکتی حقیقت میں اس کی قوت متخیلہ صرف جلوہ گاہ عنصری کی ادا شناس ہے۔

ذیل میں شکسپیئر سے مومن کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ بیشک شکسپیئر فطرتِ انسانی کا بہت بڑا نکتہ شناس ہے۔ لیکن دیکھیئے مشرقی شاعر کے خیال سے اسکے خیالات کی دنیا میں کتنا فرق ہے۔

But, soft: what light Through you window breaks
It is The east, and uliets is The sun
Arise, fair sun kill The envious moon
Who is already sick and pale with grief
With loved light wings did I o'erperch
There walls
For slony limits can not hold love
out.
O! Sweer not by The moon, The inconstant
moon
That monthly changes in her circled orb.

یہ اشعار رومیو جولیٹ کے بہت مشہور ڈرامے کے ہیں۔ پہلے اشعار میں دیکھنا چاہیئے کہ رومیو جولیٹ سے ملنے گیا ہے جولیٹ دریچے سے نظارہ فروشی کر رہی ہے۔ رومیو اس منظر کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

" دریچہ مشرق ہے اور جولیٹ آفتاب۔ آفتابِ مشرق سے نکلا ہے۔ اس اجالی رات میں ماہتاب کی روشنی جو زرد معلوم ہوتی ہے وہ حسد سے۔ کیونکہ آفتاب

(یعنی جولیٹ سے حسد کرتا ہے۔

اے خوبصورت آفتاب، حاسد ماہتاب کو اپنے غمزے سے قتل کر ڈالی۔
اس کے مقابلے میں مومن کا شعر ملاحظہ ہو۔

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

مومن کہتا ہے کہ میں جو معشوق کا نظارہ کرکے حیران رہ گیا تو گویا میری آنکھوں نے مجھکو تماشا بنا دیا، اس تماشے کو معشوق دیر تک دیکھا کیا۔ عاشق کا تماشا بننا معشوق کا دیکھنا حسن و عشق کا کیسا انوکھا اور دلچسپ بیان ہے۔

رومیو دیوار پھاند کر جولیٹ تک پہنچا ہے وہ تعجب سے پوچھتی ہے تم کیسے آئے؟ درمیان میں پتھر کی دیواریں حائل تھیں وہ کہتا ہے۔ کہ ہلکے پھلکے بازو پتھر کی دیواروں کی پرواہ نہیں کرتے انہوں نے اڑا کر پہنچا دیا ہے)

مومن کہتا ہے۔

تھی نوحہ زنی دل کے بتانے کو ضروری　　　شاید کہ وہ گھبرا کے سر بام نکلتا

مومن معشوق کو خود بام تک بلاتا ہے لیکن کس طرح کہ باوجود ناز معشوقانہ آنا ضروری ہو

جولیٹ رومیو سے پیمان محبت لینے پر قسم کھلاتی ہے وہ چاند کی قسم کھاتا ہے جولیٹ کہتی ہے "چاند تو ہر مہینے میں بدل جاتا ہے۔ کہیں تم بھی نہ بدل جاؤ۔

مومن کہتا ہے۔

سچ ہے سچا آپ کا پیماں ولے　　　مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

مومن کا معشوق عہد کرتا ہے کہ وہ کل پھر آئے گا۔ عاشق کہتا ہے آپ کا وعدہ سچا سہی لیکن اس درمیان میں اگر موت آگئی تو وعدۂ فردا کرنے سے رہی۔ دوسرے یہ کہ

معشوق کا جانا ہی موت ہے۔ موت کل کا وعدہ نہیں کرتی۔

ان دونوں شعروں کے لطف کو ارباب ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں، مومن نے اپنے الفاظ کی جادونگاری سے مضمون کو دوبالا کر دیا ہے۔

مومن اور شعرائے اردو

میر و مومن

اس میں شک نہیں کہ اردو غزل گوئی میں میر کا کوئی جواب نہیں۔ انہوں نے غزل کے لئے ایک اقلیم بنا لی ہے لیکن اسکے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ میر جذبات تغزل کے نشہ میں اس قدر متوالے ہیں کہ ان کو الفاظ اور دوسرے آورد کے اہتمام اور انتظام کی طرف چنداں توجہ نہیں ہوئی۔ مومن نے جذبات کے ساتھ قیود اور پابندی کے آورد میں آورد کا رنگ پیدا کرکے دنیا کے سامنے ایک نئی چیز پیش کی ہے۔ دعوےٰ کی دلیل مستحکم کرنے کے لئے موازنہ ضروری ہے اس لئے دونوں کی غزلیں ہم قافیہ اور ہم ردیف درج کی جاتی ہیں ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

میر

گرمی سے میں تو آتش غم کے پگھل گیا
راتوں کو رونے رونے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تھے
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمیٔ عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑھی ہوئی تھی لیکن سنبھل گیا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میرؔ
مجنوں کے دشتِ خار کا دامن بھی جل گیا

مومن

پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موئے پر خلل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم بھی نکل گیا

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

جوں خفتگان خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی کروٹ بدل گیا

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

تنخلے ہے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

میر

لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور تیرے
کار شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا

بے چشم نم رسیدہ پانی چوانے تک
وقت اخیر اس کے بیمار تک نہ پہنچا

یہ بخت تیرہ دیکھو باغ زمانہ میں ہے
پژمردہ گل بھی اپنے دستار تک نہ پہنچا

مومن

اللہ رے ناتوانی جب شدت قلق میں
بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا

مفت آدل سخن میں عاشق نے جان دیدی
قاصد بیان تیرا اقرار تک نہ پہنچا

میر

سمجھی نہ باد صبا کہ آ کر اٹھا دیا
اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

تکلیفِ دادِ دل کو عبث ہمنشیں سنے گی دردِ سخن نے میر سبھوں کو رولا دیا۔

مومن

جلن لگے بدلے مجھ کو زمین پر گرا دیا اس شوخ بے حجاب نے پردہ اٹھا دیا

فرماتے ہیں وصال ہے انجام کارِ عشق کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا

رشکِ فغاں کی ہائے رقیب آفریں بلا محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا

ہمدم دکھا اب اس کو کسی ڈھب کہ رحم آئے ناصح کو میرے حالِ زبوں نے رُلا دیا

ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر

مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

مومن نے اپنی ایک مرصع غزل میں لفظ "گویا" اسی طرح استعمال کیا ہے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ترازو کے ایک پلے میں اس لفظ کو رکھئے اور دوسرے میں میر کی یہ غزل جسمیں گویا ردیف ہے

غنچہ ہے وہ دہان ہے گویا ہونٹھ پہ رنگ پان ہے گویا

مرے مرنے سے بھی وہ چونکتے ہیں اب تلک مجھ میں جان ہے گویا

جب سے سنتے ہوئے گل ہے مرغِ چمن جب یہاں ہی بے زبان ہے گویا

لیک ہیں اس غزل میں شعر بلند یہ زمیں آسمان ہے گویا

وہی سوزِ مزاج شعر میں ہے

میر اب تک جوان ہے گویا

انصاف سے بتائیے وزن کس کا زیادہ ہے۔ حالانکہ مومن کا درجہ اُردو غزلگوئی میں تمیر کے بعد ہی ہے۔ لیکن مومن نے اپنی جدت طرازیوں سے ایک لفظ کو الماس مرتی بنایا ہے کہ جس کے وزن کا موتی بڑے بڑے جوہریوں کے جواہر خانہ میں تلاش کرنا بے سود ہے۔

مسلّم الثبوت استاد سے موازنہ کے بعد معاصرین سے تقابل کی بھی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ تمیر کا زمانہ کچھ اور تھا اور مومن کا کچھ اور۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ کے اعتبار سے دونوں کی شاعری متاثر ہوئی لیکن معاصرین سے مقابلہ کے بعد مومن کا جوہر کھل جائے گا۔

غالبؔ مومنؔ

اپنے معاصرین میں سب سے پہلے ہندوستان کے الہامی شاعر غالبؔ سے موازنہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ غالبؔ مومنؔ کی شاعری میں تشبیہات۔ رنگ بلاغت۔ طرز فصاحت۔ انداز بیان۔ محاکات۔ تخییل۔ ادائے مضمون وغیرہ میں اشتراک اور یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن نگاہ حقیقت شناس اس فرق و امتیاز کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی جو ان دونوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ حقیقت میں دونوں مختلف راہوں کے چلنے والے اور مختلف مذاق رکھنے والے تھے! اور دونوں کے رنگ طبائع میں بعید اختلاف تھا۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی "دیوان مومن" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ صدق جذبات اور ندرت اسلوب میں کوئی اُستاد مشکل سے مومن کا ہمسر ہوگا۔ نازک خیالی کی صفت میں البتہ غالب ان کے شریک ہیں۔ مگر دونوں کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ صداقت آشکارا ہوگی۔ کہ مومن اسمیں اُن سے سبقت لے گئے ہیں پھر دونوں کی تخئیل کا میدان مختلف ہے۔ سب پر مستزاد یہ کہ غالب کا کلام منتخب ہے اور مومن کو یہ موقع نہیں ملا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مومن کی شاعری میں جو ہمہ گیری ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو ان کا کلام شعر کی تمام اصناف پر حاوی ہے۔ اور اسمیں ایک طرف نازک خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف معاملہ بندی کے۔ گویا وہ فغانی کے انداز کے بھی مالک ہیں اور شرف جہاں کے طرز میں بھی ماہر ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص تغزل میں نظیری کو۔ نازک خیالی میں عرفی کو اور وقوعہ گوئی میں وحشی کو دیکھنا چاہے تو مومن کو دیکھ لے جن کی شاعری بیک وقت تینوں کے طرز کی جامع ہے"

ہم ثبوت میں دونوں استادوں کی ہم طرح غزل پیش کرتے ہیں۔ جن میں ایک سی زمین میں دونوں نے گلفشانیاں کی ہیں

غالب

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شب ماہتاب میں

مومن

تاثیرِ صبر میں نہ اثر اضطراب میں | بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں | سارے گلے تمام ہوئے اِک جواب میں
ہے نالہ مُنہ سے جھڑتے ہیں پَے گریہ آنکھ سے | اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں | پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں
کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں | بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

غالب کی غزل کا پہلا شعر دیکھئے مصرعہ اولیٰ میں الفاظ کی مشکل پسندی۔ نار۔ النہاب نے شعر کو تغزل کی حد سے باہر کر دیا ہے۔ "ملتی ہے خوئے یار سے" ترکیب نار والنہاب کی مناسبت سے الفاظ و معانی میں عذوبت اور سلاست باقی نہیں رہی ہے مومن کا پہلا شعر اس کے مقابلے میں دیکھئے جذبات عشق کے اعتبار سے کس قدر مناسب اور موزوں الفاظ لائے ہیں معنوی اعتبار سے مومن کے شعر سے غالب کو کوئی مناسبت نہیں۔ غالب کہتا ہے کہ عذاب میں اس لئے راحت ہے کہ اس میں دوست کی خو ہے اس اتنے سے مضمون کے لئے الفاظ کا اتنا بڑا پہاڑ کھڑا کر دیا ہے۔ لیکن مومن کہتا ہے کہ صبر اور اضطراب دونوں بیکار ہیں۔ گویا کہ ارتفاعِ نقیضین کو مومن نے ثابت کرنا چاہا ہے۔ جب یہ صورت ہے کہ نہ صبر کرنے سے اور نہ اضطراب سے کچھ حاصل ہو تو اس وقت جان پر کیسا عذاب ہوتا ہے۔ لفظ بے چارگی نے اس شعر میں وہ کام کیا ہے جو جسم میں روح کرتی ہے۔ اس کی بلاغت پر جتنا غور کیجئے گا شعر میں لطف پیدا ہوتا جائے گا۔

جواب کے قافیہ میں غالب قاصد کے آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ لینا چاہتے ہیں (میں

جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں) جواب میں مفہوم اور مضمون لطفِ الشاعر میں ہے۔
مومن نے کس قدر بلیغ مضمون ادا کیا ہے کہ "دیکھتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں"
اس نتیجہ کو اس طرح دکھاتا ہے۔ کہ مقدمات کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ یہ جواب ایسا
لاجواب ہے کہ پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تیسرا شعر اضطراب کے قافیہ کا ہے۔ غالب کا
منشاء ہے۔ کہ قاصد نے آکر یا خود معشوق نے وصل کا مژدہ سنایا یا وصل حاصل ہوا
کچھ صاف نہیں۔ یہ صورت خدا ساز بات ہے۔ اس خوشی میں جان نذر کرنا تھا لیکن اس
کو بھول گیا۔ پورے شعر میں اگر اپنی طرف سے الفاظ اور عبارات کا اضافہ نہ کیجئے تو
شعر چیستاں بنا رہتا ہے۔ مومن کہتا ہے کہ دل کے ٹکڑے نالہ بن کر آنکھ سے نکل
رہے ہیں اس کو دیکھنا چاہیئے یہ چھپنے کی ضرورت نہیں۔ بے گریہ آنکھ سے۔ اس لئے
کہا کہ بجائے اشک دل کے ٹکڑے نکلتے ہیں۔ جھڑنے کے لفظ سے پھول جھڑنے کی
طرف بھی لطیف اشارہ ہوتا ہے۔ اب دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ غالب کے یہاں
محذوفات نے شعر کو راز بنا دیا ہے۔ مومن نے مختصر الفاظ میں صفحہ کے صفحہ داستان کی
رنگین بیان کر دی ہے۔

انتخاب کے
قافیہ میں مومن کا شعر غالب کے شعر سے اتنا بلند ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں
غالب نے واقعہ بیان کیا ہے۔ مومن نے دلربا تصویر کھینچی ہے۔ شباب کے قافیہ میں
مومن نے ناکامیوں کا عجیب و غریب فلسفہ بیان کیا ہے
اب ہم دوسری غزل بھی ہم طرحی دونوں کی پیش کرتے ہیں۔

غالب۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز — نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے — ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں

جاں مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

مومن

کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر — پر کیا کریں کہ اس کو سر امتحاں نہیں
اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال — دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں
پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا — قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں
اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار — دنیا کی حسرتیں مرے دل پہ گراں نہیں

ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا
بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں

پہلے شعر میں مضمون تقریباً یکساں ہیں فرق یہ ہے کہ غالب کہتا ہے کہ وہ جفا کرتا ہے مگر امتحاں کے لئے نہیں۔ مومن کہتا ہے کہ جفا کرتا ہی نہیں۔ ورنہ عمر بھر ہم اس سے وفا کئے جاتے۔ اسمیں حرماں و مایوسی کا مضمون غالب کے شعر سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ جفا ہونے میں تو ایک امید بھی ہے یعنی اگر آج اس کو خواہش

امتحان نہیں تو ممکن ہے کہ کسی وقت پیدا ہو جائے۔ مگر وہ بدنصیب واقعی بہت بڑا بدنصیب ہے جس پر جفا بھی نہیں کی جاتی اس کے علاوہ وہ پہلے مصرعہ کی صفائی بیان کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ پر کیا کریں کہ ٹکڑے نے اور بھی زیادہ مجبوری کا رنگ پیدا کر دیا۔ اور اس ابہام (ایہام) نے کہ "اب کیا وفا کریں" اس بات پر بھی کافی روشنی ڈال دی۔ کہ ہم کو اظہار وفا کا بھی موقع نہیں دیا جاتا۔

دوسرے شعر میں غالب و مومن دونوں نے منطقی استدلال کے ذریعے شعر میں عجیب و غریب لطف پیدا کر دیا ہے۔ اور استدلال کی صورت بھی تقریباً دونوں کی یکساں ہے۔

تیسرے اور چوتھے شعر میں غالب کے یہاں شوکت کے سوا شعر میں کوئی خوبی نہیں باوجودیکہ اس کو مرزا نے قطعہ کی صورت میں کہا ہے مگر کوئی خاص خوبی پیدا نہ کر سکے اس کے برعکس مومن نے صرف ایک ہی شعر میں سوز و ساز کی دنیا بھر دی ہے

پانچویں شعر میں غالب نے ایک شوخی کا انداز قائم رکھتے ہوئے تغزل کی حد میں کہا ہے۔ اور نہایت عمدہ صورت سے کہا ہے۔ اور نہایت عمدہ صورت سے کہا ہے۔ مگر مومن کے یہاں ایک ناصحانہ انداز بیان ہے۔ مومن کے نزدیک حسرت بھی سبک ہو کر رہ گئی۔

اسی طرح تیسری غزل بھی قابل غور ہے۔

غالب

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خون ہے ‏ ‏ ‏ رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں ‏ ‏ ‏ دراز دستئ قاتل کے امتحاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مومن

وہ لعل روح فزا دے کہاں ملک بوسے
کہ جو ہے کم ہے یہاں شوق جانفشاں کیلیے

بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اسکے امتحاں کیلیے

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امید یکشبہ ہے یاسِ جاوداں کے لئے

کہاں وہ عیشِ اسیری کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیمِ برقِ بلا روزِ آشیاں کے لئے

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے

پہلے شعر میں غالب کی بندش کی چستی قابلِ داد ہے۔ اور مضمون میں کافی جگر کاوی سے کام لیا گیا ہے۔ مگر یہ شانِ عشق کے منافی ہے۔ مومن نے لعل روح فزا اور شوق جانفزا کی ترکیبوں سے اس کو بہت بلند کر دیا ہے۔

دوسرا شعر اس میں شک نہیں کہ غالب کا لاجواب ہے لیکن مومن کا اس قافیہ اتنا کہنا بھی کمال ہے۔

تیسرے شعر میں غالب کے یہاں سوائے شوخیٔ بیان اور کچھ نہیں ہے مگر مومن نے اس قافیہ کو غالب سے بہت اچھا کہا ہے۔ چوتھا شعر غالب کے بہترین شعروں میں

شمار ہوتا ہے مگر بعض لوگوں کے نزدیک یہ صرف نظری دھوکہ ہے۔ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ مرغ قفس میں آشیاں بنانے کے لئے خس فراہم کیونکر کر سکتا ہے۔ اسیر سے یہ آزادانہ حرکتیں نہایت مستبعد خیال کی جاتی ہیں مگر برخلاف اس کے مومن نے بالکل منطقیانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اور مصرعہ اس قدر صاف اور سادہ لگایا ہے کہ یہ شعر یقیناً غالب کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔

غالب کا پانچواں شعر عطر غزل کہا جا سکتا ہے۔ ایجاز و اختصار کے لحاظ سے اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اسی لئے مولانا حالی وغیرہ نے اس کی بیحد تعریف کی ہے۔ مگر مومن نے اس قافیہ کے کہنے میں نہایت دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے کام لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اپنے رنگ پر قائم رہ کر اتنا عمدہ کہا ہے کہ غالب کے شعر سے اگر زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔

غالب سے حسن ظن رکھنے والوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اسلوب بیان کی ندرت کو حد کمال پر پہنچا دیا ہے معمولی سے معمولی باتیں بھی اس عمدگی سے بیان کرتے ہیں کہ اسکی مثال اُردو شاعری میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ ممکن ہے یہ خیال کسی حد تک صحیح ہو اور اسمیں شک نہیں کہ غالب کو اسلوب بیان کی جدت و ندرت میں امتیازی مرتبہ حاصل ہے اور ہم اسے کشف و الہام قرار دینے میں تامل نہیں نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمارے خیال میں وہ اس طرز کے موجد اور مخترع نہیں کہے جا سکتے غور سے دیکھا جائے گا تو غالب نے جدت اسلوب میں جو کمالات دکھائے ہیں مومن کی جدت پسند طبیعت بھی اس سے بیگانہ تھی۔ ان کے مذاق کی صحت اور خدا داد ملکہ نے وہ اسلوب غزل کو دیا جو نہایت شگفتہ۔ رواں اور لبریز ترنم ہے دور حاضر

کے سب سے بڑے نقاد حضرت نیاز فتحپوری نے غالب و مومن کے امتیازی فرق کو بہت عمدہ طریقہ سے نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"مومن فارسی ترکیبیں استعمال کرنے میں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اور اس باب میں جو چیز انہیں غالب سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ ترکیبوں کی نزاکت ہے نہ کہ اُن کا اغلاق۔ غالب کی فارسی ترکیبوں ہیں۔ اشکال لفظی کے ساتھ دقتِ معنی پیدا پیدا ہوتی ہے، برخلاف مومن کے یہاں ترکیبوں کی لطافت کے ساتھ مفہوم سبح ہو جاتا ہے۔"

"اس میں شک نہیں کہ مومن و غالب دونوں نے فارسی ترکیبوں کے استعمال میں عرفی و بیدل کا تتبع کیا اور بہت سی ترکیبیں وہی یا اسی نوع کی اختیار کیں جو عرفی و بیدل کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس باب میں مومن کو نہ صرف اولیت بلکہ افضلیت حاصل ہے اور غالب کے نقوش "نقش ثانی" کا حکم رکھتے ہیں گو بہتر از اول نہ ہوں۔ ہر چند غالب کے اُردو کلام کا بہت بڑا حصہ بعض انہیں ثقیل ترکیبوں کی وجہ سے حذف ہو چکا ہے۔ لیکن موجودہ نسخہ میں بھی جا بجا ان کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ مومن کے یہاں یہ ترکیبیں انکے کلام میں اس قدر حسن و لطافت کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ کہ خود غالب کی طرح مومن کو ان کے حذف کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ دنیا نے اُن کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ ہر چند غالب کے اس شعر سے کہ

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالب نے بیدل کو سامنے رکھ کر فارسی ترکیبیں استعمال کیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اسکی تحریک پیدا ہوئی۔ مومن کے کلام کو دیکھ کر۔ پھر چونکہ

غالب اپنی فطرت کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ انہیں لوگ مومن کا تتبع سمجھیں اس لئے انہوں نے اسمیں بہت زیادہ گہرا رنگ پیدا کرنا چاہا اور اس طرح کلام مومن سے امتیاز پیدا کرنے کی کوشش میں اوّل اوّل اُنکے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلے جو باوجود ثقل تراکیب کے کوئی ندرت مفہوم نہ رکھتے تھے۔

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ　　مبارک باد اسد غمخوار جان دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

بفیض بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے　　کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ یہ انداز شاعری نہ محمود ہے نہ مقبول تو مجبوراً انہیں پھر مومن ہی کی سطح پر آنا پڑا اور اس میں شک نہیں کہ غالب اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ ذیل کے اشعار کو اگر آپ مومن کے اشعار میں ملا دیجئے تو امتیاز دشوار ہو جائے گا۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا | نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں | شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں | تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
دماغ عطر پیراہن نہیں ہے | غم آوارگی ہائے صبا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

مومن کے یہاں قسم اول کا اغلاق مفہوم یا ثقل ترکیب تقریباً مفقود ہے"۔

واقعہ یہ ہے کہ فارسی کی خوشنما ترکیبوں کو سلیقہ سے برمحل استعمال کرنے میں مومن نہ صرف غالب کے مدِ مقابل ہیں بلکہ ان سے کہیں آگے ہیں اور بلا شبہ اسکے استعمال میں انہوں نے کسی قسم کی بے اعتدالی نہیں برتی ہے جو ترکیب بھی ہے اپنی جگہ پر نگینے کی طرح لگی ہوئی ہے اور بعض ترکیبیں فارسی سے مستعار لینے کی بجائے خود ایجاد کی ہیں اُن میں بھی لطافت ونزاکت کی وہی جلوہ گری ہے اصول صرف ونحو او معانی وبلاغت کے اعتبار سے جن کی صحت میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے پورے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں مل سکتا جس کی بندش لیست ہو یا

انداز بیان غیر فصیح ہو خیالات میں تازگی و ندرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ اپنے تمام معاصرین میں فائق ہیں۔ لیکن ہم یہاں اردو کے ممتاز ادیب جناب عبدالباری آسی صاحب لکھنوی کا یہ جملہ نقل کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔

" سنتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر کوئی مومن کا جواب ہے تو وہ غالب ہے اور اگر کوئی غالب کا جواب ہے تو وہ مومن ہے"

ذوق و مومن

بعض لوگوں کے نزدیک ذوق کی زبان اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ صاف اور سلیس ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ صنائع لفظی کا التزام جس بے تکلفی کے ساتھ مومن کے یہاں نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف ذوق بلکہ اُنکے تمام ممتاز معاصرین کے یہاں بھی مفقود ہے مومن بعض اوقات صنائع لفظی کے پیچ میں ایسے پرلطف مضامین ادا کر جاتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے محاورات کی آمیزش بھی ان کے یہاں کم دلچسپ نہیں ہے۔ البتہ ذوق کی زبان میں دوسروں کی نسبت سلاست اور روانی زیادہ ہے۔ لیکن مومن نے اپنے ہر شعر میں تلاش مضمون۔ نزاکت تخیل۔ طرز ادا اور دلپذیر اسلوب سے تغزل کا ایک سدا بہار گلدستہ تیار کر دیا ہے۔ مقابلہ کے لئے حسب ذیل ہم طرحی غزل ملاحظہ ہو۔

ذوق

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے

نہیں ثبات بلندئ عزّ و شاں کے لئے　　کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے
ہزار لطف ہیں جو ہر ستم ہیں جاں کے لئے　　ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں دوستی کہ یہ شے　　عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک مردِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

مومنؔ

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے　　سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا　　وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے

بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اسکے امتحاں کیلئے

جرأتؔ و مومنؔ

جرأت و مومن میں صرف ایک وصف مشترک ہے یعنی معاملہ بندی۔ صفیر بلگرامی تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں" جرأت اس رنگ کے موجد تھے مگر بسبب کم علمی بہت کھل گئے تھے۔ مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا۔ کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے"۔

جرأت

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

بات ہی اوّل تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی
اور جو بولے ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا

بے سبب جو مجھ سے ہے وہ شعلۂ خو سرگرم جنگ
میں تو ہوں حیراں کہ یہ کس کا ہے بھڑکایا ہوا

جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے اجی بیٹھے رہو
ہوں میں اپنی زیست سے اس درجہ اکتایا ہوا

حکم بار مجلس اب جرأت کو بھی ہو جائے جی
یہ بیچارہ کب سے دروازے پہ ہے آیا ہوا

مومن

کیا قہر طعن بوالہوس بے ادب ہوا
جرم رقیب قتل کا میرے سبب ہوا

بوسے سے دم غضب لئے الٹی سمجھ تو دیکھ
بل جو پڑا جبیں پہ تمنا کو لب ہوا

کس دن تھی اسکے دل میں محبت جو اب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

جی طعنِ وصلِ حور سے کب جلا دیا
روز جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا

ربط بتان دشمن دیں اتہام ہے
ایسا گناہ حضرت مومن سے کب ہوا

ناسخ و مومن

شاعری بحیثیت فن کے ناسخ کے یہاں حد کمال کو پہنچی ہوئی ہے لیکن چونکہ لکھنؤ کے

شعراء خارجی متعلقات حسن وعشق پر زیادہ زور دیتے تھے جس کی وجہ سے ان کا کلام پھیکا اور بے اثر ہو کر رہ گیا۔ اسکے برخلاف مومن کی شاعری اکثر اساتذۂ دلی کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے انکے یہاں مضامین وصل وہجر رشک وشکایت۔ رندی وسرمستی سب میں داخلی انداز نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر ان اشعار میں دونوں کا امتیازی فرق نمایاں ہے۔

ناسخ

نہ میرے پاؤں ہوں زنجیر کے کبھی مشتاق　　جو اسکی کاکلِ پیچاں کے ہاتھ میں لٹ ہو
کبود رنگ ہے مستی کا تیرے ہونٹ ہیں لال　　ملیں جو دونوں تو پیدا نہ کیوں اُداہٹ ہو
نسیم آہ کے جھونکے سے کھولتے ہم ہیں　　بھڑا ہوا تیرے دروازے کا اگر پٹ ہو
ہجوم رکھتے ہیں جانباز یوں ترے آگے
جو اریوں کا دیوالی کو جیسے جمگھٹ ہو

مومن

یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی　　نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے
سمجھنا کیوں نہ دیوانے کی باتیں　　نہ پایا محرم اپنے راز داں کو
عیش میں تم کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے

فارسی کلام

مومن کی تصنیفات میں اردو کلیات کے علاوہ ایک انشائے فارسی اور دیوان فارسی بھی ہے جنہیں ان کے عزیز حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا۔ یہ کتابیں ۱۲۷۱ھ میں مطبع سلطانی واقع دہلی میں چھاپی گئی تھیں۔

کلام نثر چند خطوط و تقاریظ پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً خود یا کسی دوسرے کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں۔ زیادہ تر ان کا مجموعہ نثر تین قسم کی تحریر پر مشتمل ہے۔

(۱) وہ خطوط جو انہوں نے خود کسی دوست یا عزیز کو لکھے ہیں اور جو اُن کی طرز تحریر کا صحیح نمونہ ہیں۔

(۲) وہ خطوط جو مخاطب کی نافہمی پر نظر کرتے ہوئے معمولی انداز میں لکھے ہیں یا کسی کی فرمائش سے تحریر کئے ہیں۔

(۳) تقریظیں خطبے اور دیباچے۔ نثر کا انداز اس زمانہ کی عام فارسی نثر سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ ہر ہر قدم پر لفظی تعقیدات صنائع و رعایات۔ تحریر کی رنگینی تشبیہات و استعارات کی فراوانی۔ مبالغہ کی کثرت مضمون کی کمی اور عبارت کی طوالت نمایاں نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں آیات قرآنی کی تضمین۔ یا اصطلاحات علمیہ کا استعمال اس تحدی سے کیا ہے کہ انکے تبحر علمی کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ اس کے ساتھ اُن کی تصانیف سے اُن کی پوری شخصیت پہچانی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اُن کے مضامین اُنکے طرز زندگی اور افتاد مزاج کی اچھی طرح پردہ دری کرتے ہیں۔ وہی عاشقانہ

چھیڑ چھاڑ، وہی شاعرانہ تعلی و خودستائی جو نظم میں ہے۔ نثر میں بھی موجود ہے۔ بندشوں کی قدرت اور زبان پر قدرت کے ساتھ کہیں کہیں اپنی تعریف میں اظہارِ جوش اور اربابِ زمانہ کی ناقدرشناسی پر تاسف اس خوبی سے کیا ہے کہ بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے۔ ذیل کے فقروں سے ان کے رنگ کا شاید کچھ اندازہ ہو۔

"از ناقدرشناسی و سخن نافہمی ہیچکسم خریدار نیست و جواہر واردہا ہرم را بہ شہرگی نیز روز بازارے نے۔ گرہ دکشاد آن قدر بستہ کہ طوفان نوح از منبع تختہ بندیم نتواند ربود و زنگار ناروائی آن چنان نہ بستہ کہ غبار صرصر عاد آئینہ ام بجلد خواہد آوردن یوسفم را بہ کلاوہ پیرزال نمی خرند و از چاہ کنعانی سیم قلب ہم نمی برند۔ با اعجاز ید بیضا تہی دستم و با دم عیسوی آزار پرستم"

مومن کا فارسی دیوان جو قصائد، متعدد غزلیات، قطعات، تواریخ، رباعیات اور ایک مختصر مثنوی پر مشتمل ہے۔ چنانچہ نامی قصائد میں چار قصیدے نعت شریف میں اور دو اپنے مرشد طریقت حضرت سید احمد بریلوی کی شان میں تحریر کیے ہیں۔ قصائد کو پڑھ کر پہلی نظر میں جو امر نمایاں ہوتا ہے وہ ان کا حسن عقیدت اور جوش مذہب ہے جو ان کے مذہبی ماحول اور بلند تربیت کا نتیجہ ہے۔ دوسری چیز ان کا جذبہ ملی ہے جو ایک ایک قدم پر نمایاں ہے سب پر مستزاد ان کا وہ فطری استغنا ہے جس نے ان کی انفرادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

یہ تو تھا قصائد کا اخلاقی پہلو۔ ادبی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بھی تشبیب میں مضامین عشقیہ کی افراط۔ نازک خیالی و متانت، روزمرہ، زور بیان۔ اصطلاحات علمیہ و تراکیب

جدیدہ ان سب امور کو دیکھتے ہوئے ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے فارسی کلام کے بعد ہی ان کا نمبر ہے۔

غزلیات فارسی کا وہی انداز ہے جو اردو غزل کا۔ نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی واردات عشق، بیان اور طرز ادا کی لطافت اسی قدر ہے کہ انکی غزل تغزل کی پوری ترجمان کہی جا سکتی ہے۔ رہے فلسفہ و تصوف ان کو کوئی غزل کی حدود میں شامل سمجھے یا نہ سمجھے مومن انہیں حدود غزل سے خارج مانتے ہیں۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لئے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

خواہم از عہد فراق تو بہ فردا نرسم
آرزو زماں زماں بہ درستی رود انتظار
ناصح کہ چاک خرقۂ مومن ببیند نمی زند
رسمے چو میکشی بہ گماں جنون شوق
بکشی نگر کہ بہ تماشا من
مکتب بہ املای خوئے نوشتم مومن
باز گو دلبر ز کوئے تو سیماب صفت چند
رہید جز از قتل من انکار می کنند
مرا کہ بندہ نوازی ہم از صنم بہ بدیم
دلم ربودی و دانم چہ مشکل افتاد است
مومن آہنگ حرم کرد بیداد نباں
ہر دم غشکش آساں کردم

خوش کنم خاطر از وعدہ پشیمان ترا
صد وعدۂ نکردہ وفا می کنم تمنیم ما
یارب نہ بیند آں صنم جامہ زیب را
پیراہن رقیب قبا کردہ ایم ما
چشمم گریان است خاص و عام را
کاش نشیں دیر باید عنایت سوئے میخانہ ما
کو غلط کردہ نپرسش رہ غم خانہ ما
گویا کہ طرز خندۂ او ہیچ گو او نیست
ہیچم بود ز جز انکار با خداوندیست
مرا معاملہ عمرے بہ ایں دل افتاد است
لبس بجاں آمدہ شاید دو منزل ہے رود
ہمم بہ باز رسئے جاناں کرد دم

ایں قدر فتنہ ہا بکار مبر ‏ ‏ ‏ ‏ سایۂ آسماں تباہ مکن
گہ با چنیں کسے سروکارے فتنہ ترا ‏ ‏ ‏ ‏ ناصح بمرگ من کہ چہ بند بر میکنی

قطعات و رباعیات وغیرہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہیں اور ان کی سخنہ مشقی کا ثبوت۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ وہ شاعری کے داخلی پہلو اور نفس تغزل کے اعتبار سے ایک بلند پایہ شاعر اور فارسی ادبیت کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز استاد ہیں۔ اور ان کے معاصرین میں صرف مرزا غالب ہی ایک شاعر ہیں جو فارسی غزلگوئی میں انکے ہمسر بلکہ بعض اعتبارات سے ان سے بہتر ہیں۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرزا کو فارسی سے فطری ذوق تھا اور مشق کامل بھی رہے مومن تو انہوں نے فارسی شاعری کو دل کی امنگ سے اختیار کیا۔ اور اسے کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ پھر بھی ان کے فارسی کلام کے متعلق مولینا عبدالحی صاحب مصنف "گل رعنا" کا خیال ہے کہ "کلام فارسی بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اور جو دلفریبیاں مومن خاں کے اردو کلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ اسمیں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں"۔

عدم مقبولیت اسباب

مومن کا پورا کلام پڑھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر کیوں اتنا بڑا جامع شاعر اپنے معاصرین کے بہ نسبت گمنام رہا اور اب تک اس کے کلام کی صحیح معنوں میں نہ داد دی جا سکی؟ مومن کی عدم مقبولیت کے اسباب پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی کے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

(۱) مصنف "آبحیات" اور صاحب "گلستان بیخزاں" نے شروع سے ان کے کمالات پہ پردہ ڈالا۔

(۲) بقول صاحب "گل رعنا" ان کو کوئی حالی سا نقاد نہیں ملا۔ ان کے تلامذہ میں کسی نے (حتیٰ کہ شیفتہ نے بھی) جیسا کہ چاہیئے ان کے محاسن کو عام جا کر نہیں کیا

(۳) ان کو تصوف و فلسفہ سے مناسبت نہ تھی یہی سبب ہے کہ ہندوستان کی موجودہ ذہنیت کو ان کے رنگ سے تباین کلی ہے۔

(۴) ان کے خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار قرار دی جا سکتی ہے۔

(۵) ان کی غیور طبیعت ہمیشہ درباری تعلقات سے نفور رہی اس وجہ سے بھی ان کو شہرت کے کافی مواقع نہ ملے۔

(۶) ان کے کلام میں مذہبیت کا عنصر کافی ہے اور اس کے ساتھ وہ مذہبی نوک جھونک سے بھی نہیں چوکتے۔ شاید اس وجہ سے بھی وہ مقبول شاعر نہ ہو سکے۔

(۲) وہ اپنے سامنے کسی استاد کی (خواہ قدیم ہو یا معاصر) کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہر ایک کو حقارت سے یاد کرتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ اس میں وہ غالب سے بھی بڑھ گئے تھے۔

مذکورہ بالا اسباب میں سے اکثر صحیح ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک اُن کی عدم مقبولیت پر غور کیا گیا بظاہر اسکے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک اُن کی خود داری جو خود پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی دوسرے اُن کی مذہبیت جسمیں وہ حد درجہ کٹر واقع ہوئے تھے۔ تیسرے اُن کے کلام کی نازک خیالی تھی جس کی زمانہ قدر نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی آ رہا ہے جب ان کے یہی عیوب محاسن بنکر اُن کی شہرت کا باعث ہمل گے۔

غور کیجئے جب دلّی جیسے شہر میں غالب کی قدر نہ کی گئی جس کو مجبور ہو کہ کہنا پڑا۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ

تم کو بے مہریِٔ یارانِ وطن یاد نہیں

تو بھلا مومن کی پذیرائی کیونکر ممکن تھی۔ ذوقؔ کے کلام سے لطف اُٹھانے والے مومن کی شاعری کو کیا خاک سمجھ سکتے تھے۔ زمانہ نے پلٹا کھایا اور دنیا ذوق کو چھوڑ کر غالب کے کلام سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اب وہ زمانہ بھی آ رہا ہے کہ مومن اُردو شاعری میں اگر غالب سے بڑھکر نہیں تو کم سے کم اسکے دوش بدوش نظر آئیں گے۔ فلسفہ۔ تصوف اخلاق وغیرہ کو جو لوگ شاعری میں ڈھونڈھتے ہیں ان کے لئے مومن کے کلام میں کوئی دلچسپی کا سامان نہیں لیکن وہ لوگ جو اظہار جذبات اور لطیف تاثرات کے لطیف اظہار بیان کے شائق ہیں وہی حقیقی معنوں میں مومن کی قدر کر سکتے ہیں۔

جذبات کے اظہار کے لئے مومن نے نئے نئے اسلوب بیان اختراع کئے ہیں اور جہاں کہیں جذبات کا تجزیہ مشکل ہو جاتا ہے۔ وہاں شاعر کو اپنی قدرت بیان اور زود طبیعت کا جوہر دکھانا پڑتا ہے۔ اور اس جگہ بسا اوقات اسے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں ایجاد کرنی پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات خیالات اتنی پیچیدگی اختیار کر لیتے ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی ان سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ چنانچہ اسی وجہ سے ذوق کی سادگی بیان کے سامنے مومن و غالب کا رنگ جم نہ سکا۔ لیکن اسلوب بیان کی ندرت بھی کوئی معمولی چیز نہ تھی وہ وقت بھی آپہنچا کہ مومن و غالب نگاہوں پر چڑھ گئے اور وہی اسباب جو کبھی مومن کی عدم مقبولیت کا باعث تھے اب قبول عام کا سبب بن رہے ہیں۔

کلام کے بعض نقائص

خطا و نسیان انسانی فطرت کا خاصہ ہے مومن بھی انسان ہیں اس لئے ضروری ہے کہ جہاں ان کے محاسن کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہاں ان کے کلام کے نقائص پر بھی ایک نظر ڈال دی جائے۔

یاد رکھنا چاہیے۔ کہ مومن نے کبھی شاعری کو فن کی حیثیت سے نہیں اختیار کیا۔ دراصل انہوں نے اپنے دوسرے مشاغل کی طرح اس کو بھی سامان دلبستگی سمجھا اور محض تفریحاً اختیار کیا۔ اس لئے اگر بعض جگہ انہوں نے صحتِ زبان کا خیال نہیں کیا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی واقفیت اور طبیعت میں کمی تھی بلکہ یہ سراسر ان کی لاپروائی کا نتیجہ تھا۔

اسکے علاوہ اس سلسلہ میں یہ بھی نہ فراموش کرنا چاہیئے۔ کہ وہ شروع میں شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے جو بقول صاحب شعر الہند بجا طور پر دہلی کے ناسخ تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اگر کسی دو شاعر کا کلام کا رنگ کچھ مل سکتا ہے۔ تو وہ شیخ ناسخ اور شاہ نصیر ہیں۔ مومن غالب۔ ذوق تینوں نے مل کر ناسخ کا تتبع کرنا چاہا اور آخر میں مجبور ہو کر ہر ایک نے اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا۔ بقول غالب "ہم نے اور مومن خاں نے یہ عہد کر لیا کہ ناسخ کا تتبع کرنا چاہئے لیکن یہ عہد کسی سے نہ نبھ سکا۔ مومن خاں اپنے پرانے رنگ پر آگئے اور میں نے میر کا طرز اختیار کیا۔" دیوان غالب نسخہ حمیدیہ میں غالب کی ایسی غزلیں موجود

ہیں جنہیں ناسخ کا رنگ تیزی سے جھلکتا ہے۔ اسی طرح کلیاتِ مومن میں بہت سی غزلیں ایسی ہیں جن کے اندر ناسخ کا رنگ بہت زیادہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اور مومن کی بعض غزلوں میں بے تاثیری اور پھیکا پن پیدا ہو گیا۔ لیکن بہتر یہ ہوا کہ بہت جلد ان دونوں شاعروں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اور ناسخ کی تقلید سے مومن و غالب نے کنارہ کشی اختیار کر لی ـــــــــــــــــ

ـــــــــــــ ورنہ اُردو شاعری کو نہ تو مومن کا انفرادی رنگ نصیب ہوتا اور نہ غالب کے فلسفیانہ حقائق عالمِ وجود میں آتے۔ مثال کے لئے حسب ذیل اشعار پڑھئے جن میں نصیر اور ناسخ کا تتبع صاف ظاہر ہے۔

بن گئے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا	شمع قد پر میرے یہ دانہ برہمن ہو گیا
بسکہ ہیں مالے برس زنار ہا غم میں ترے	جلیٹھ اور بیسا کھ بھی چاند سا دن ہو گیا

آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے
چشم کا سوراخ لو کشتی کا روزن ہو گیا

ـــــــــــــ

ظلم کا ثمرہ یہی تھا دیکھ کر گلہائے داغ	بید مجنوں کی طرح وہ سرو رعنا ہو گیا
ہے مشبک بسکہ رونے سے مرے چشم اے ماہرو	شب جو اشک آیا تو اک عقدِ ثریا ہو گیا

ـــــــــــــ

دوست مرتا ہوں اس روئے عرق آلودہ پر
لاش بھی میری بہانا بعد مردن آب میں

اس طرح مومن کے کلام کے اندر تصنع آمیز پیچیدگی کے ساتھ مبتذل خیالات نے

جگہ پائی اور رعایات لفظی و صنائع کی بھرمار سے کلام بے کیف ہو گیا ہے۔

بعض جگہ وہ خیالات کی پرواز اور اسلوب بیان کی جدت میں حد درجہ تجاوز کر جاتے ہیں اس لئے بعض جگہ ان کے اشعار معمہ بن گئے ہیں۔ مثلاً

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

کیا رام نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا
الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

تا نیر بے قراری ناکام آفریں
ہے کام ان سے شوخ شمائل کا تھامنا

ذکر اغیار سے ہوا معلوم
حرف ناصح برا نہیں ہوتا۔

خیالات کی ندرت کے علاوہ بندش کی تعقید خاص طور پر ان کے کلام کے اغلاق کی ذمہ دار ہے جیسے اُن کے یہ اشعار ہیں۔

بے حجابی کا گلہ کیجیے تو کہتا ہے ترے
پردہ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا

ہاں جوشش تپش جھپٹ چلی جائے کہ پر تو
جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

غرق گریۂ خوں بس رہا نہ کر مومن!!
لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ

خدایا نشۂ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا
لبوں پر دم بلا ہے جوش خوں شوق شہادت کا

ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحہ سے
زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

لکھو گے بدمستی غم تاکہ وہ ہمکیش پڑھ لے
باندھ دیتا ہوں سر شیشۂ صہبا کاغذ

غم خانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز
جلتے ہیں یعنی چاہیے آنکھوں سے پھر چراغ

وہ گبر دین دیکھ یہ حالت ہوئی تغیر تثلیثہ کی
کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دبۂ شیشہ کی

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے   منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

کبھی نامانوس اور ثقیل ترکیبوں سے شعر کو گورکھ دھندا بنا دیتے ہیں اور انتخاب الفاظ اکثر بے محل ہوتا ہے۔ متروکات کا استعمال زیادہ ہے مثلاً نیند و شور عجز۔ ادراک سیمیائے غرض شموس۔ فلک نو آفریں۔ وجہ عطاس عز و جاہ۔ خجلت آب بیکسی۔ زبان بیہود سائل وغیرہ۔ یا۔ املاؤس۔ افیوس۔ ادا فیوس انشاموس، بلبوس جام نمرود۔ فال اختر۔ قمر چاکرہ مثلث عائل سجدہ و امثال۔ افتلائے صدوم حدیث صنعانی وغیرہ۔

وہ اکثر جگہ مشکل اصطلاحات، اشارات بعیدہ اور تلمیحات سے کام لیتے ہیں جس کو عام آدمی آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔

وہ نعرۂ علمہ سحابی   جس نے کہ اس آگ کو بجھایا

پڑھ کر فوراً ذہن قصۂ حضرت خلیل کی طرف منتقل ہونا۔ یا

جلتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے   مومن غضب ہے لذت آتش فزائے داغ

حتیٰ آیۂ کریمہ اوبد لنا ھم جلوداً غیرھا تک خیال کا پہنچنا۔ یا

تیشہ کچھ دشنۂ شیرویہ نہیں اے غیرت   اپنے ہی خوں سے مگر دامن فرہاد بھرے

سنکر شیرویہ کے اپنے باپ (خسرو پرویز) کو قتل کرنے کے تاریخی واقعے تک حافظے کا رسا ہونا دشوار اور یقیناً دشوار ہے۔

بعض جگہ انہوں نے غزل میں اپنی علمیت کا اظہار کیا ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے   رجعت قہقری کج رخ دقمر آخر شب

قرآنِ انجم سیارہ برج آبی میں ڈبوئے گی مری چشم ستارہ بار مجھے

اس کے علاوہ مومن کی دُنیا بہت محدود ہے۔ انہوں نے جو کچھ اظہارِ خیال فرمایا وہ صرف "تنگنائے غزل" میں اور اس میں بھی ان کا میدان بہت تنگ ہے۔ چند مضامین خاص طور سے اختیار کئے ہیں۔ یہ نقائص اگر ان کے کلام میں نہ ہوتے تو بہتر تھا۔ پھر بھی ان باتوں کے باوجود ان کے کمال میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آسکتا۔ وہ یقیناً بے نظیر شاعر تھے۔ اور زمانہ ایسے باکمالوں کو بہت مدت کے بعد پیدا کرتا ہے۔

مومن کا شعرائے مابعد پر اثر

مومن کے فکر و اسلوب نے اردو غزل کو بیحد متاثر کیا ہے۔ اس کی شاعری اور زندگی میں ایک ایسی لطیف ہم آہنگی ہے کہ اس کی مہذب غزلیت آج بھی لطف دیتی ہے اور شاعرانِ نو کے لئے شمع راہ بنی رہتی ہے اس کے تر دماغ کلام اور بے مثل اسلوب بیان سے شعرائے مابعد نے گہرا اثر لیا ہے۔

پچھلے پچیس برس میں ہزاروں نئی ترکیبیں وضع ہوئی ہیں جو شاعرانِ نو کی جدت بیاں کی غمازی کرتی ہیں۔ یہ مثالیں بھی زیادہ تر مومن اسکول میں ملیں گی۔ زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود جو کچھ نظر آتی ہے وہ ایک معنی کر کے مومن ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے مقلدین میں شیفتہ کا خاص رنگ ہے شیفتہ ہی کے کلام میں مومن کی سی ہموار اور خوشگوار ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اشکِ گل ریز۔ خراشِ ناخنِ غم۔ مطربِ بعاد و ترانہ۔ ظنِ نیم ستم۔ دلِ شورش ادا۔ مستیٔ نیم خام۔ شوق غلط کار۔ توبۂ تولیدہ۔ اسی طرح شیفتہ کے اکثر اشعار بھی طرزِ مومن میں ملتے ہیں۔

یاں سبک حرفِ ملامت واں گراں عرضِ نیاز — سخت جاں میں کب نہ تھا اور نازنیں تو کب نہ تھا

کب ہمیں حاجتِ پرہیز پڑی — غم نہ کھایا تھا کہ سم یاد آیا

اس سے میں شکوے کی جا شکرِ ستم کر آیا — کیا کروں تھا مرے دل میں سو زباں پر آیا

فصلِ گل ہے میکدہ کا ساز و ساماں چاہیئے — توبۂ ژولیدہ زیب طاقِ نسیاں چاہیئے

واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم بچتے ہیں اس قدر جو دہر کی ہوا سے ہم
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین

مولانا حالی نے بالواسطہ مومن سے استفادہ کیا ہے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے

مومن جہاں ندرتِ ادا اور خوبصورت فارسی ترکیبوں کے موجد ہیں وہاں اس کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ اس کی غزل کی جان اُس کا مقطع ہوتا ہے یہ خصوصیت فانی بدایونی کی شاعری کا بھی ایک نمایاں وصف ہے۔ چنانچہ چند مقطع پیش کئے جاتے ہیں۔

زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانی
کس سے سیکھا ترے ذرّوں نے بیاباں ہونا خاکِ فانی کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں
کچھ اب کے بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے چمن سے رخصتِ فانی قریب ہے شاید
شورِ لبیک جو فانی لبِ ساحل سے اُٹھا کس کی کشتیِ تہِ گردابِ فنا جا پہنچی
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز آج روزِ وصال فانی ہے

مومن کی طرح سائل دہلوی بھی اپنے تخلص سے بہت فائدہ اُٹھاتے ہیں کمال یہ ہے کہ کلام کا لطف ہر جگہ باقی رہتا ہے رعایت لفظی کی تکرار اتنی نہیں ہونے پاتی کہ سننے والوں کو الجھن ہو جائے۔ بلکہ ہر جگہ ایسے مزے کے ساتھ سائل کا لفظ آتا ہے کہ ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دربان کو تاکید ہے دروازے پہ روکو   آئندہ کسی بھیس میں سائل اگر آئے

بن گئے سائل تو کیا شانِ امامت گھٹ گئی   دیکھنے والے نہیں کھاتے ہیں دھوکا نام سے

سائل سوال کر کے نہ کھونا تم آبرو   دنیا میں ایک چیز ہے بس آدمی کی بات

مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے غزلوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان کے بعض اشعار پر مومن کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کی ایک غزل ہے جو مومن کی مشہور غزل "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کی یاد دلاتی ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ 'خالقِ باری' کی طرح بچوں کے لئے لغت کا مجموعہ تیار کرتا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

وہی کارواں وہی قافلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن
اسے وزن کہتے ہیں شعر کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی شکر ہے جو سپاس ہے وہ ملول ہے جو اداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی نقص ہے وہی کھوٹ ہے وہی ضرر ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ہے ندی، وہی نہر ہے، وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بلبلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے بھید کہتے ہو راز ہے جسے باجا کہتے ہو ساز ہے
جسے تان کہتے ہو ہے نوا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی خوار ہے جو ذلیل ہے وہی دست بیج بخیل ہے
بد و نیک کیا ہے بُرا بھلا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اصغر گونڈوی بھی مومن کے سلسلۂ تلانذہ میں ہیں۔ یعنی منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہیں جو مومن کے شاگرد دخواص نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اصغر کے کلام میں مومن کی بداعت اسلوب اور شگفتگی ترکیب خاص طور سے جلوہ گر ہوئی ہے۔

رُخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
جوشِ شباب۔ نشۂ صہبا۔ ہجوم شوق — تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو
تھا لطف بھول دیدۂ خونبابہ فشاں سے — پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا
موج نسیم صبح کے قربان جایئے — آئی ہے بوئے زلفِ معنبر لئے ہوئے
جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم — چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

حسرت موہانی کی شاعری میں نفسیاتی واقعیت اور حسن و عشق کے گوناگوں پہلو ملتے ہیں۔ ان کا سرچشمہ بھی ایک معنی کر کے مومن کا ہی کلام ہے۔ حسرت بھی مومن کی طرح اکثر اشعار میں تھوڑی سی ایسی پیچیدگی پسند کرتے ہیں جو طبیعت میں الجھاؤ نہ پیدا ہونے دے بلکہ معنویت و لطف زیادہ کر دے اور حقیقت میں انہوں نے جا بجا مومن کی پیروی کی ہے چنانچہ خود کہتے ہیں۔

مرحبا حسرت بنائی خوب تصویرِ سخن — رنگِ مومن خوشنما کس لجہ اس پیکر میں ہے

مومن کے یہاں نازک خیالی اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ حسرت کے یہاں بھی ان ہی جلوؤں کی نمود ہے مومن کے یہاں تشبیہہ و استعارہ بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے وہ کلام میں ایک خاص خصوصیت پیدا کر دیتا ہے حسرت

کے یہاں بھی خصوصیت پورے کمال پر ہے۔ مومن بلند پروازی اور تخیل کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری بھی کر جاتا ہے۔ حسرت کے یہاں یہ حسن اپنے شباب پر ہے اب ذرا حسرت کے یہاں مومن کا رنگ ملاحظہ کیجیے۔

اثر تجھے تغافل کا رقیب کامراں تک ہے — وجودِ رشک یعنی اضطراب بدگماں تک ہے
ابھی دیکھیں نہیں گستاخیاں جوشِ تمنا کی — تمہاری کم نگاہی التماسِ بے زباں تک ہے
مری مجبوریاں مشقِ جفا سے باز رکھیں گی — ترا شوقِ ستم ظالم خیالِ امتحاں تک ہے
سکھا دے گی ندامت شیوۂ قدرِ وفا ان کو — یہ شانِ کج ادائی میری جانِ ناتواں تک ہے
وہی جورِ خزاں ہوگا وہی محرومیاں ہوں گی — نشاطِ بلبلِ بیدل بہارِ بوستاں تک ہے

اس طرح حسرت کے یہاں کافی تعداد میں غزلیں مومن کے رنگ میں ملتی ہیں۔ حسرت کی ایک اور غزل ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ وہ کہاں تک مومن کے رنگ کو نباہنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

بند ایسی شورشِ غم کس دلِ مضطر میں ہے — جس سے جنبش ہے زمیں کو آسماں چکر میں ہے
جلوہ فرما ہے جو وہ حسنِ خود آرا بے نقاب — اک قیامت اور برپا عرصۂ محشر میں ہے
دام اس میں بے خطا اسیں قفس ہے بے قصور — شوقِ پابندی نہاں خود میرے بال و پر میں ہے
کس قدر بیباک ہے دربردہ کیسی بے حجاب — وہ نظر پنہاں جو اس چشمِ حیا پرور میں ہے

آخر کے دو شعر تو بالکل مومن کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ پڑھنے والے کو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ حسرت کی زبان میں مومن کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ مومن کے رنگ میں تین شعر اور حسرت کے پیش کیے جاتے ہیں، دیکھیے کس غضب کے ہیں۔

آہ اس سے نارسائی جو رہتی تو خوب تھا — کیوں اس حریمِ عشق میں یوں بے محل گئی
آہ اس نگاہِ شوق کی مستی جو بے خبر — خوبی پہ روئے یار کے پہلے پہل گئی
رنگینیوں کی جان ہے وہ پائے نازنیں — میری نگاہِ شوق جہاں سر کے بل گئی

اسی طرح ایک اور شعر مومن کے رنگ میں خوب ہے۔

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک کو — نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے

اگرچہ مومن کے مقلدین میں سب سے زیادہ کامیاب حسرت ہیں اور ان کے علاوہ جگر۔ فراق۔ توفیق حیدر آبادی۔ شفیق جونپوری وغیرہ کے کلام میں مومن کا اثر نمایاں دکھائی دیتا ہے ـــ مومن کا تلامذہ جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے تو قریب قریب سب ہی مومن سے متاثر رہے ہیں۔ اور سب کے ہی کلام میں مومن کا رنگ کسی نہ کسی پہلو سے نمایاں ہوا ہے۔

لیکن داغ جرأت سے زیادہ قریب ہونے کے باوجود مومن سے متاثر ہوئے۔ اگرچہ وہ مومن کی سی سنجیدگی اور متانت کے قائل نہیں ہوئے مگر مومن کی نفسیاتی گہرائی اور معنوی وسعت کو اپنائے رہے حسن و عشق ان کا بھی موضوع رہا اور ان کا بھی ـــ اگرچہ بڑے اختلاف اور بڑے تضاد کے ساتھ، بالکل ایسے ہی جیسے ایک بازاری دل پھینک ہو اور دوسرا عاشق و پرستار ہو' ایک کے یہاں سب کچھ روا ہے اور دوسرے کے یہاں بہت کچھ 'نا روا' ایک جو کچھ جی میں آتا ہے کہہ جاتا ہے اور دوسرا زبان تو زبان۔ خیال و تصور پر بھی پہرے بٹھائے رکھتا ہے پھر بھی یہ بڑا اختلاف اور بڑا تضاد مومن کی جھلکیاں اور چھاپیں نہیں چھپا سکتا۔ بلکہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ داغ مومن کو طرح طرح سے چھپاتے رہتے ہیں۔ چاہے وہ طرح طرح

سے ظاہر ہوتے جاتے ہیں اور داغ کو داغ بنائے جاتے ہیں۔ وہ داغ ہیں جس میں جرأت ہے۔ وہ داغ جس میں مومن ہے

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے — کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری — غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

لے ہی تو آئیں گے اُسے ہمدم — میرے ہی نام سے تو آئے گا

عمر کے دن گذرتے جاتے ہیں — جیتے جی ہم تو مرتے جاتے ہیں

ہم نے بھی صبرِ دل کو مجھے ہی لیا — اب وہ اگلا سا اضطراب کہاں

ہے طبیعت سے آدمی مجبور — دل لگانا کوئی ثواب نہیں

سب خاک ہوئیں آج مرِنے کی اُمیدیں — کل تک تو تری ذات سے کیا کیا نہ لگی تھا

تو نے آرام کچھ دیا اے مرگ — زندگی کیا رہی وبال رہا!

بدگمانی نے نہ چھوڑا اُسے تنہا چھوڑ دیا — میں نے قاصد کو الگ راہ میں چلنے نہ دیا

آسماں دوست ہو گیا تیرا — اب زمانہ بدل نہیں سکتا

عیش بھی اندوہ فزا ہو گیا — ہائے طبیعت تجھے کیا ہو گیا

یہ دل کو تاب کہاں ہے کہ ہو مآل اندیش — انہوں نے وعدہ کیا اس نے اعتبار کیا

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی — عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لیے

تجھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو — اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

یہ داغ ہیں — دیکھ لیجئے مومن کی جھلکیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ داغ میں نہیں — امیر مینائی میں مومن کی سنجیدگی اور متانت پائی گئی اگرچہ اُن کی سنجیدگی اور متانت میں مومن کی زندگی نہیں آئی اور نہ بہت

کچھ رد کھی پھیکی رہی مگر اس پہلو سے وہ دوسرے شعرا کی نسبت مومن سے زیادہ قریب رہے اور تہذیب کی ریخت .نیت پر مائل نہ ہوئے۔

اُلفت میں برابر ہے جفا ہو کہ وفا ہو — ہر بات میں لذّت ہے اگر دل میں مزا ہو

تجھ کو مانگوں میں تجھی سے کہ سبھی کچھ مل جائے — سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

ہاتھ رکھ کر میرے سینے پہ جگر تھام لیا — تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

داغ سے قریب ہونے کی کوشش کے باوجود مومن سے دور نہیں ہو سکے یہ ہیں' امیر مینائی۔

چکبست شاید اُردو کے واحد شاعر ہیں جو غالب اور مومن سے برابر قریب رہے۔ اگرچہ وہ براہِ راست مومن سے متاثر ہوتے ہوئے دکھائی نہیں پڑتے لیکن اُن پر مومن کے اسلوب کی پرچھائیاں پڑتی ہیں۔

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا — دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے — نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں — وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

میر سے متاثر ہونے والے شاعر مومن کا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکے شاہ عظیم آبادی ایسے شعرا میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اُردو غزل میں لطافت اور ندرتِ طرز کی قدروں کو نکھارا جو میر کے بعد مومن کے یہاں نمایاں ہیں ہے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ذرا سی ٹھیس بھی شیشے کو کتنی بہت ساقی — ہزار تو نے بچایا تھا' بال آہی گیا!

غضب نگاہ نے ساقی کے بندولست کیا ۔۔۔ شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا
تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے ۔۔۔ اخیر وقت جو آیا چھپے نہ رازدان کے

مومن کی طرح حسن و عشق کو شاعری کی روح بنائے رکھا اور زبان کی سادگی اور اسلوب کی شوخی سے قبولیتِ عام پائی اور اس طرزِ خاص میں نام پیدا کیا جو جلیل کو امیر و داغ کے اثرات سے حاصل ہوئی تھی ۔

کوئی سُنے نہ سُنے مجھ کو دردِ دل کہنا ۔۔۔ اثر کرے نہ کرے مجھ کو آہ کر لینا
یا خدا درد محبت میں اثر ہے کہ نہیں ۔۔۔ جس پہ مرتا ہوں اسے میری خبر ہے کہ نہیں
نکلتی ہے اس میں بھی شان اک وفا کی ۔۔۔ یوں ہی تم دغا پر دغا دیتے جاؤ
وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو ۔۔۔ کیا اب جواب دوں نگہِ انتظار کو
دل ہے عجیب گل چمنِ روزگار میں ۔۔۔ رنگت تو پھول کی ہے مگر بو وفا کی ہے

داغ کے شاگرد مگر داغ کا رنگ نہیں، مومن اور غالب کا مجموعہ تھے، نہ الگ مومن نہ الگ غالب ۔۔۔ دونوں کے معتقد بھی تھے اور میر و بھی ۔۔۔ بیخود تک شاعری کا رنگ دہلی لو دیا گیا ان میں اور اُن کی شاعری میں دلی کی آن بان تھی اور وہ غالب اور مومن کی شاعری کے نمائندے تھے ۔

جاتے ہی اُن کے گویا کچھ بھی نہ تھا چمن میں
جوشِ بہارِ گل کو پامال کر گئے ہیں

اے ضبطِ گریہ خاک میں مل جائے کاش تو ۔۔۔ آنکھیں ترس گئیں مِری دریا کے واسطے
دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے ۔۔۔ دوستی دشمنی نہ ہو جائے
اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں ۔۔۔ عاشقی بندگی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں — کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

"بشریت" کے ساتھ "مومنیت" یگانہ کے یہاں بڑے ہی تیکھے تیوروں کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے، اس آن بان کا شاعر اُردو شاعری کو شاید اس سے پہلے نہیں ملا۔ ہر تیور تلوار ہو جاتا ہے وہ نشتر اور نشتریت کا قائل نہیں، تلوار ہوتا ہے۔ اور تلوار مارتا ہے۔ عزمِ استقلال اور حوصلہ کو کہیں سرنگوں نہیں ہونے دیتا، کلام قوی اور توانا جذبات و خیالات کا آئینہ دار ہے، وہ اُردو کا حکیم غزل گو ہے اور اپنی طرز کا آپ ہی موجد ہے اور آپ ہی خاتم ہے اُس کی طرز قریب قریب ناقابلِ تسخیر و تقلید ہے،

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ — کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پہ — ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

جرس نے مژدۂ منزل سُنا کے چونکا یا — نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

اکھڑا اپنوں کے ساتھ کہیں دم نکل نہ جائے — آساں نہیں ہے رنج اُٹھانا خمار کا

بسی ہے نکہتِ آوارہ کن دماغوں میں — مبارک ہستیٔ برباد پر مغرور ہو جانا

آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے — سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزل کیا دیکھ کر

خدا جانے اجل کو کس پہ پہلے رحم آئے گا — گرفتارِ قفس پہ یا گرفتارِ نشیمن پر

دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ وار — پاس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبانِ بہار

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف — کان اب تک ہوس بانگِ درا کرتے ہیں

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو! — دل میں سوائے یار کسی کا گذر نہیں

بہت دستِ جنوں نے گدگدایا جب تو کیا کرتے — اُتاریں بیڑیاں اور پہنے دونوں طوق گردن میں

بقدرِ حوصلہ ملتی ہے دادِ عشق و ہوس
مزاجِ حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

خزاں کے دم سے مٹا خوب و زشت کا جھگڑا
چلو یہ خوب ہوا گل رہے نہ خار رہے

اس سلسلے کا اس دور میں واحد شاعر فراقؔ ہے، نہ جانے کیوں بعض اوقات غزل کے ارتقا پر غور کرتے ہوئے فکر میرؔ سے مومنؔ اور مومنؔ سے فراقؔ تک جست بھر لیتا ہے، بہرکیف میرؔ اور مومنؔ کی غزل کی روایات کا علمبردار ہے اور غزل کے ایک نئے مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ خدا کرے اردو شاعری کو اس نئے مستقبل کا سفر طے کرنے کے لئے کوئی جانباز مل جائے۔ یہ نیا مستقبل اس خواب کی تعبیر ہوگا۔ جو پلتا رہا ہے۔ میرؔ۔ غالبؔ اور مومنؔ کی آنکھوں میں اور سحر خیز ہونے کو آیا ہے فراقؔ کی آنکھوں میں۔

جہاں میں تھی بس اِک افواہ تیرے جلووں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حسن کیا ہو مگر
نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا

اب تو مجھ کو بھی میرے درد کا احساس نہیں
مشکلِ عشق مبارک تجھے آسان ہونا

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی اُمید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

ہو کے مجبورِ محبت سے ہیں نا آشنا کی لیکن
اتنے آزاد نہ ہو جائیں کہ کچھ کر نہ سکیں

سر بھی انھیں ملا در و دیوار بھی مگر
کم ہو سکی نہ وحشتِ زنداں کبھی!

دیارِ دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں
حریمِ عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

گو ہمہ تن وہ جبر ہے کہتی ہیں یہ مشیتیں
ہم سے بھی کچھ نہ بن پڑے عشق جو اپنی ضد پہ آئے

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا
اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اُسے بےگانہ

نہ پوچھ عرصۂ ہستی کی وسعت و تنگی
جو چل پڑے تو بیاباں، رکے تو زنداں ہے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں ۔۔۔۔ تو نے تو خیر بے وفائی کی

اور خدا کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا. یعنی میر اور مومن زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مرنے کے لئے پیدا ہی نہ ہوئے تھے بلکہ زندہ اور ہمیشہ زندہ رہنے اور اردو کو زندہ رکھنے کے لئے پیدا ہوئے تھے ۔

مشاہیر کی نظر میں

"دنیائے ادب میں کوئی فیصلہ قطعی نہیں کیا جا سکتا، یہاں شخصی حکومت نہیں جمہوریت ہے۔"

مومن کی شاعری پر تبصرہ کرنے کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہنچے وہ یہ ہے کہ اسکے کلام میں ایک غیر محسوس لطافت، ایک غیر فانی تاثر، ایک ابدی لذت، ایک لازوال کیف اور ایک روح نواز ترنم موجود ہے۔ ادب اردو میں سب کچھ نقش باطل کی طرح محو گردش روزگار ہو سکتا ہے لیکن مومن کا عاشقانہ کلام دنیا کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس لئے کہ اسکی شہرت بقائے دوام کی منزل پر پہنچ چکی ہے۔

ذیل میں اردو کے بلند پایہ ادیبوں، نقادوں شاعروں اور تذکرہ نگاروں کی رائیوں کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہو سکے گا۔ کہ مومن کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے۔ اسے ہرگز مفرط ستائش نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

غالب "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر "تم میرے پاس ہوتے ہو گویا" مجھ کو دے دیتا۔ (یادگار غالب)

شیفتہ حکیم صاحب کے غیر محدود کمالات کے مقابلہ میں شاعری ان کا ادنیٰ ترین کمال ہے۔ با اینہمہ شعر گوئی میں ان کا مثیل نہیں پیدا ہوا۔ کسی کو ایک صنف میں ایسی قدرت نہ ہو گی جیسی ان کو تمام اصناف سخن میں ہے جس کو اس میں کچھ شک ہو وہ ان کا دیوان اٹھا کر دیکھ لے اور میرے کلام کی تصدیق کرے۔ اردو فارسی دونوں

میں انہیں وہ دستگاہ حاصل ہے کہ ہندی اور ایرانی دونوں اُن کی ذات پر فخر و مباہات کرتے ہیں" (گلشن بیخار)

"فن شعر کے آغاز سے آج تک کسی نے اُن کی مثل شاعری نہیں کی۔ غیر کے کلام کو انکے کلام سے وہی نسبت ہے۔ جو مسلمہ کذاب کے ہذیانات کو قرآن سے"
(دیباچہ کلیات مومن)

حالی "مومن خاں مرحوم اس خصوصیت (نزاکت خیال) میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں" (یادگار غالب)

محمد حسین آزاد۔ ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں (آبحیات)

مولوی کریم الدین۔ درباب فنون نظمیہ کے خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے استاد نصیر وغیرہ تمام افراد پہ سبقت لے گئے ہیں۔ (تذکرہ شعرائے ہند)

صفیر بلگرامی۔ مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل فہمی اور نزاکت کی خوبی سے ایسے پردے میں رکھا کہ دانشناس ہی اسکے مزے کو جانتا ہے (جلوہ خضر)

سید علی حسن خاں۔ جہاں استاد است دانا داند کہ پایۂ ریختہ از پستی بہ اوج رسانیدہ اوست۔ غزلیات او لاجواب است و مثنویات او بہتر انتخاب است" (بزم سخن)

نواب امداد امام اثر۔ مومن زود و متین سے مضامین غلبیہ میں کم سہی لیکن اُن کی غزل سرائی پہ اہل دہلی بلکہ ہر دیار کے اہل مذاق کو ناز ہونا چاہیئے" (کاشف الحقائق)

مولینا عبدالحی۔ مومن نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے۔ وہ انکی ذہانت اور جولانئ طبیعت کا تماشا گاہ ہے انداز بیاں کہیں کیفیت سے خالی نہیں۔ (گل رعنا)

مولٰینا عبد السلام ندوی۔ ان کی عاشق مزاجی نے ان کو جرأت کے رنگ کی طرف مائل کیا لیکن انہوں نے اس میں بھی دلی کی شان کو قائم رکھا اور نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے۔ (شعرالہند)

نیاز فتحپوری۔ اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بیاستثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دیجائے تو میں بلا تامل کہدوں گا۔ کہ "مجھے کلیات مومن دیدو اور باقی سب اٹھالے جاؤ"

(نگار مومن نمبر)

رام بابو سکسینہ۔ مومن اپنے خیالات کی بلندی اور بلند پروازی کی ندرت میں سب سے الگ او ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے تشبیہات اور استعارے معمولی سطح سے اس قدر بلند ہیں کہ ان کے اشعار اس خصوصیت میں بالکل نمایاں ہیں۔

شیخ محمد اکرام۔ مومن خود ایک بہت بلند مرتبہ شاعر تھا۔ اور مرزا کی طرح فارسی کا شائق۔

(غالب نامہ)

ضیاء احمد بدایونی۔ مومن کی شاعری میں جو ہمہ گیری ہے۔ وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ انکا کلام شعر کی تمام اصناف پر حاوی ہے اور اسمیں ایک طرف نازک خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف معاملہ بندی کے۔ گویا وہ فغانی کے انداز کے بھی مالک ہیں۔ اور شرف جہاں کے طرز کے بھی ماہر ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص تغزل میں نظیری کو نازک خیالی میں عرفی کو۔ اور دنومہ گوئی میں وحشی کو دیکھنا ہو تو مومن کو دیکھ لے جن کی شاعری بیک وقت تینوں کے طرز کی جامع ہے۔"

(مقدمہ دیوان مومن)

سید اعجاز احمد معجز سہسوانی۔ ان کے نازک خیالات عام شعراء کی دسترس سے
بلند ہیں۔ ہر شعر دقیق معنی اور لطیف احساس کا ایک طلسم ہے۔ دقت آفرینی، نازک
خیالی، معاملات کی رنگینی، تہ گیسوؤں کی دلنشینی اور مضامین کی ندرت ان کے اشعار
کی زینت ہیں۔ میر تقی میر سے لے کر مرزا غالب تک جتنے صاحب کمال شعراء ہوئے
ہیں مومن خاں کا پایہ اُن کی خصوصیات کے لحاظ سے سب میں ممتاز و بلند ہے
(مومن و غالب)

کیفی چریا کوٹی۔ مومن دنیائے شاعری میں میر کے بعد پہلے شخص ہیں جو الفاظ
کو شعر میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں اور اس فن میں موزونیت اور مناسبت کا ایسا کمال
دکھاتے ہیں جو نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے" (نگار)

غلام ربانی عزیز۔ مومن قدرت کی طرف سے ایک نہایت زبردست بلند پرواز
تخیل لائے ہیں وہ اپنی مخصوص فضا میں اڑتے ہیں اور نہایت بلند اڑتے ہیں اور
یہ ان کا نہایت اعلےٰ کمال ہے" (نگار)

عبدالباری آسی۔ سنتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر کوئی مومن کا جواب ہے
تو وہ غالب ہے اور اگر کوئی غالب کا جواب ہے تو وہ مومن ہے" (نگار مومن نمبر)

اقلیباز احمد بی۔ اے علیگ۔ اردو شاعری مومن کی نزاکت تخیل کی
مثال نہیں پیش کر سکی (نگار مومن نمبر)

ڈاکٹر اعجاز حسین۔ مومن کا دل عشق کی لذت سے خوب واقف تھا۔ اس
وجہ سے درد اور مزا کلام کو دلکش اور پُر لطف بنا دیتا ہے۔
اشعار میں تھوڑی سی پیچیدگی، طنز، تشبیہ اور استعارے کی ندرت اُنکی انفرادی

خصوصیات ہیں۔ فرسودہ خیال کو بھی اسلوب بیان کے زور سے نیا کر لیتے ہیں جس سے پرلطف معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی جذبات نگاری میں اصلیت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ واردات قلب اور محبت کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر شعر کہتے تھے۔

(مختصر تاریخ ادب اردو)

خواجہ احمد فاروقی۔ اس کی شاعری اور زندگی میں ایک لطیف ہم آہنگی ہے اسی لئے اسکی مہذب بغزلیت آج بھی لطف دیتی ہے۔ اور شاعران عصر حاضر کے لئے شمع راہ بنی ہوئی ہے۔ مومن کی غزل بے جان نہیں ہے اسمیں زندگی تازگی اور ندرت ہے۔

مجنوں گورکھپوری۔ مومن میں علوئے تخیل اور دقت نظر اور بھی جذبات کی شدت اور کیفیات کے خلوص پر غالب ہیں (دیوان)

ماہر القادری۔ مومن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت بیان کی شوخی ہے اور یہ اثر ہے اس کی بے پناہ عاشقانہ فطرت کا (شاہکار)

میر رضا علی۔ مومن کو چمنستان عالم کی صرف باون بہاریں دیکھنی نصیب ہوئیں پندرہ بیس برس اگر اور زندہ ہوتے تو غالباً ایمان شاعری کے پیاسوں کو مومن جیسے سرچشمۂ کمال کی طرف رجوع کر کے اپنی پیاس بجھانے اور مومن کے ہاتھ پر بیعت کلام کرنے موقع مل جاتا۔

(اعمالنامہ)

ظہیر دہلوی - طرز مومن نہ آگاہ تھے جبتک کہ ظہیر — سچ تو یہ ہے کہ کبھی لطف غزل نے نہ دیا

بیخود دہلوی - زباں ہو داغ کی تو ہر مضمون مومن کا — بیاں غالب کا ہو اشعار کی وہ شان پیدا کر

حسرت موہانی - مرحبا حسرت ہنائی خوب تصویر سخن — رنگ تو مومن خوشنما کس درجہ اس بیکر میں ہے

کتابیات

اس کتاب کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی اس کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ بزمِ سخن — مصنف — علی حسن خاں

۲۔ سخن شعرا — ″ — عبدالغفور النساخ

۳۔ کاشف الحقائق — ″ — سید امداد امام اثر

۴۔ گلشن بیخار — ″ — شیفتہ

۵۔ طور کلیم — ″ — نور الحسن

۶۔ جلوۂ خضر — ″ — صفیر بلگرامی

۷۔ تذکرۂ شعرائے اردو — ″ — مولوی کریم الدین

۸۔ آبِ حیات — ″ — محمد حسین آزاد

۹۔ گلِ رعنا — ″ — مولوی عبدالحی

۱۰۔ شعر الہند — ″ — عبدالسلام ندوی

۱۱۔ خمخانۂ جاوید — ″ — لالہ سری رام

۱۲۔ تاریخ ادب اردو — ″ — رام بابو سکسینہ

۱۳۔ مختصر تاریخ ادب اردو — ″ — ڈاکٹر اعجاز حسین

۱۴۔ مومن و غالب — ″ — حکیم اعجاز احمد معجز سہسوانی

۱۵- شرح دیوان مومن	مصنفہ	پروفیسر ضیاء احمد بدایونی
۱۶- شرح قصائد مومن	"	"
۱۷- نگار مومن نمبر	"	نیاز فتحپوری
۱۸- اعمال نامہ	"	سر سید رضا علی
۱۹- مومن کی شاعری	"	عارف ہسوی
۲۰- حیات مومن	"	عرش گیاوی
۲۱- یادگار غالب	"	مولینا حالی
۲۲- سیرت احمد شہید	"	ابوالحسن علی ندوی
۲۳- غالب نامہ	"	شیخ محمد اکرام
۲۴- مولینا اسمعیل شہید	"	عبداللہ بٹ
۲۵- ہندوستانی مسلمان	"	مسٹر ڈبلو-ڈبلو ہنٹر
۲۶- دلی کا ایک یادگار مشاعرہ	"	مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی
۲۷- حدائق السحر فی دقائق الشعر	"	رشید الدین وطواط
۲۸- المعجم فی معائر اشعار العجم	"	شمس الدین محمد بن قیس رازی
۲۹- شعر العجم	"	مولینا شبلی نعمانی
۳۰- مقدمہ شعر و شاعری	"	مولینا حالی
۳۱- ہماری شاعری	"	مسعود حسن رضوی ادیب
۳۲- انتقادیات	"	نیاز فتحپوری
۳۳- مرآۃ الشعر	"	مولینا عبدالرحمن دہلوی

۴۳۔ نقد الادب مصنفہ حامد اللہ افسر میرٹھی

اسکے علاوہ جن رسالوں کے مضامین سے استفادہ کیا گیا۔ وہ حسب ذیل ہیں
اُردوئے معلی (کانپور) زمانہ (کانپور۔ اُردو (انجمن ترقی اُردو) جامعہ (دہلی)
الناظر (لکھنؤ) خضر راہ لکھنؤ۔ نگار لکھنؤ۔ العلم اعظم گڑھ۔ شاہکار گورکھپور۔ ایوان
گورکھپور۔ ہمایوں لاہور۔ نیرنگ خیال لاہور۔ علیگڈھ میگزین علیگڈھ ساقی دہلی
ادبی دنیا لاہور۔ سحبان گورکھپور۔ عالمگیر لاہور